ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اپنے والد مرحوم یارقند خان کے متعلق اس کتاب کی ترتیب و تالیف میرے لئے ایک محبت اور عقیدت کے سفر کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کتاب کی تدوین کے مختلف مراحل میں کی جانے والی کوششیں میرے لئے خوشی اور اطمینانِ قلب کا باعث بنیں ۔ مجھے ایسے لگا کہ اس کتاب کے اوراق میں میری ملاقات ایک بار پھر اپنے والد اور اُن کے دوستوں سے ہو رہی ہے اور میں اُن کے محبت بھرے تعلقات اور دوستانہ گپ شپ سے محظوظ ہو رہا ہوں ۔ میری خواہش ہے کہ اس کتاب کے قارئین بھی اس خوبصورت تجربہ میں میرے ساتھ شریک ہوں ۔

اپنے مرحوم والد کی زندگی کے متعلق کتاب کی ترتیب میرے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی ۔ میری کوشش اور خواہش تھی کہ اُن کی شخصیت کے مختلف پہلو لوگوں کے سامنے واضح ہوں ۔ ایک انسان ہونے کے ناطے یارقند خان اپنی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں سے بھی مبرا نہیں تھے لیکن اُن کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی اپنی خامیوں پر فخر نہیں کیا اور اپنی خوبیوں اور خدمات کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا۔ اُن کی زندگی کا یہ طور طریقہ میرے لئے مشعلِ راہ بنا رہا اور میری کوشش رہی کہ اُن کو حتی الوسع اس طرح پیش کیا جائے جس طرح وہ اپنی زندگی میں تھے ۔

اس کتاب کو مرتب کرنے کا خیال میرے ذہن میں اس لئے آیا کہ والد صاحب کو لکھنے کا شوق تھا اور انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر تحریریں لکھیں جو اُن کے کاغذات میں بکھری پڑی تھیں ۔ اُن میں زیادہ تر تحریریں اُن کے قریبی دوستوں کے متعلق تھیں جو مزاحیہ نوعیت کی تھیں ۔ اُن کی تقریباً تمام تحریروں کو میں اُن کی زندگی کے دوران پڑھ چکا تھا۔

انہوں نے نہ تو ان تحریروں کو ایک جگہ ترتیب سے جمع کرنے کی کوئی کوشش کی اور نہ ان کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لگتا ہے کہ لکھنے کا یہ سارا عمل انہوں نے اپنے ذوق کی تسکین اور اپنے قریبی دوستوں کو محظوظ کرنے کے لئے کیا تھا۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کی تمام تحریروں کو جمع کرنے کا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے اُن کے کاغذات میں اُن تحریروں کو ڈھونڈ نا شروع کیا اور اُن کو ایک جگہ جمع کیا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اُن کی کئی تحریریں مجھے نہ مل سکیں۔ خصوصاً مجھے اس کا بہت دکھ ہے کہ اُن کی چھیاسی صفحات پر مشتمل تحریر جو اُن کے سفر کالام سے متعلق تھیں کہیں گم یا ضائع ہوگئی۔ میرے خیال میں وہ اُن کی سب سے شاہکار تحریر تھی۔ بعد میں مجھے یہ خیال آیا کہ ان تحریروں کو شائع کیا جائے کیونکہ اکثر لوگوں کو ان کی شخصیت کے اس پہلو سے آگاہی نہیں ہے۔ پھر یہ تجویز بھی ذہن میں آئی کہ اس کتاب میں اُن کا ایک مختصر تعارف اور اُن کے دوستوں کے تاثرات بھی شامل کیے جائیں۔ اس طرح کتاب کا خاکہ تیار ہوا۔

اس کتاب کی تحریر و تدوین پر مجھے اس لئے بھی خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے صوبہ میں بالعموم اور ہمارے علاقے کاٹلنگ ضلع مردان میں بالخصوص کتابیں لکھنے اور پڑھنے کا شوق اور رواج بہت کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کے دور میں جب قلم کی طاقت تلوار کی دھار اور ضرب سے کہیں بڑھ کر ہے ہمارے لئے ضروری ہے کہ کتابوں سے شغف پیدا کریں۔ اگر اس کتاب کے ذریعے ہم اپنے علاقہ کے لوگوں خصوصاً بچوں اور نوجوانوں میں علم و ادب کے ذوق کو تھوڑی سی ترقی دینے میں کامیاب ہوگئے تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔

یہاں پر میں ایک وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں یہ احساس ہے کہ اس کتاب میں مرحوم یار قند خان کے بہت سے دوستوں کا ذکر نہیں ہوا ہوگا یا اُن کے تاثرات شامل کرنے سے رہ گئے ہوں گے کیونکہ اُن کے دوستوں کا ایک بہت بڑا حلقہ تھا اور اُن میں بہت سوں تک ہماری رسائی نہ ہوسکی اس لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کرتے ہیں کہ انشاءاللہ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اُن سب کے تاثرات شائع کرنے کی کوشش کریں

گے جو ایسا کرنے کے خواہشمند ہیں۔

خاندانی پس منظر:

یارقند خان کاٹلنگ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تاریخ پیدائش کا صحیح پتہ نہیں لیکن سال 1935ء تھا۔ اُن کے والد کا نام سیف ظفر خان تھا اُن کے دادا محمد اکبر خان کاٹلنگ کے سب سے بڑے زمیندار تھے اور خان صیب کے اعزاز سے نوازے گئے تھے۔ اُن کا اس پورے علاقہ میں بڑا نام تھا اور حکمرانوں کے حلقے میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ محمد اکبر خان کاٹلنگ کے نمبردار تھے اور انہوں نے اپنے علاقہ کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سی خدمات سرانجام دیں۔ اس علاقہ کی زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے نہر اپر سوات کی منظوری اور تعمیر میں اُن کا اہم کردار رہا ہے۔ اُن کی وفات کے بعد نمبرداری اُن کے بیٹے سیف ظفر خان کے حصے میں آئی۔ اُن کے علاوہ محمد اکبر خان کے چار اور بیٹے تھے جن کے نام عبدالحکیم خان، ہمیش خان، غلام حیدر خان اور گل حسن خان تھے۔ اُن کی اولاد میں سے خان باچا خان، لعل باچا خان، گل باچا خان، وفادار خان، ابوالحسن خان، کرم خان، علی حیدر خان، خان بہادر خان، شیر بہادر خان، یار محمد خان، حاجی خیر محمد خان، فتح محمد خان ہیڈ ماسٹر صاحب اور تاج محمد خان قابلِ ذکر ہیں اور اپنے وقت کے جانے پہچانے لوگ تھے۔

یارقند خان کے علاوہ سیف ظفر خان کے تین بیٹے ثمرقند خان، حاجی زرقند خان اور ملک صنوبر خان اور چار بیٹیاں تھیں۔ یارقند خان اُن میں سب سے چھوٹے تھے۔ سیف ظفر خان کی وفات کے بعد صنوبر خان نمبردار بن گئے اور اسی وجہ سے ملک صاحب کے نام سے جانے جاتے رہے۔ جب یارقند خان کی عمر تقریباً تین سال کی تھی تو اُن کے والد کا انتقال ہوا۔ یارقند خان ہمیشہ اپنے باپ کی کمی محسوس کرتے رہے اور اس بات کا ذکر کرتے ہوئے رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اپنے والد کی وفات کے وقت وہ اتنے چھوٹے تھے کہ اُنہیں اپنے والد کی

شکل بھی صحیح طرح یادنہیں بس اُنہیں اتنا یاد ہے کہ اُن کی لمبی سفید داڑھی تھی۔

بچپن ہی میں اپنے والد کی وفات کے علاوہ اُنہیں دوسرا بڑا صدمہ اُس وقت اُٹھانا پڑا جب اُن کے بڑے بھائی ثمرقند خان کو ایک مقدمے میں عمر قید کی سزا ہوئی اور اُنہیں جزیرہ انڈیمان جسے عرفِ عام میں ''کالا پانی'' کہا جاتا تھا بھیج دیا گیا جس پر کچھ عرصہ بعد دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپانی فوج نے قبضہ کرلیا اور اس لڑائی کے دوران ثمرقند خان مبینہ طور پر جاں بحق ہو گئے۔ یارقند خان بڑی حسرت سے اُن کا ذکر کرتے اور اس دوران کبھی کبھی اُن کی آنکھیں نم ناک ہو جاتیں۔ وہ کہتے کہ اُن کے بڑے بھائی کو اُن سے اور اُن کی سب سے چھوٹی بہن (والدہ عطاء اللہ خان شاہ ڈھنڈ) سے اتنی محبت تھی کہ وہ اُن دونوں کو مردان جیل بلواتے اور اُن کے ساتھ کھیلتے اور پیار کرتے۔

والد صاحب کے مطابق اگر چہ اُن کا گھرانہ بہت معزز اور صاحب جائیداد تھا لیکن اُن کا بچپن نسبتاً غربت میں گزرا۔ دراصل اُن دنوں اکثر زمینیں بنجر تھیں اور باقی کی پیداوار بھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اُن کے مطابق اُن کے بزرگوں نے بھی بہت سادہ زندگی بسر کی اور ان کے والد سیف ظفر خان اپنی گزراوقات کے لئے تجارت کرتے تھے۔

یارقند خان کو اپنے گھر والوں سے بہت محبت تھی۔ اُن کی دو مائیں تھیں اور وہ دونوں کی ایک طرح عزت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب اُن کے والد کی وفات کے بعد اُن کی گھریلو تقسیم ہوئی تو اُن کی بڑی امی کافی عرصہ تک اُن کے ساتھ مقیم رہیں۔ چونکہ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے اپنی والدہ کے چہیتے تھے اور وہ ساری عمر اُن کے ساتھ مقیم رہیں۔ اُن کے بڑے بھائی ملک صنوبر خان کی خواہش تھی کہ والدہ اُن کے ساتھ رہے لیکن وہ اپنے چھوٹے بیٹے کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ اپنی ماں کے لاڈ پیار نے یارقند خان کو تھوڑا بہت نقصان بھی پہنچایا اور وہ جوانی میں کافی ضدی اور طبیعت کے تیز ہو گئے لیکن اُن کی والدہ اُن کی ہر قسم کی حرکتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی رہیں۔ ایک مرتبہ والد صاحب

کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے کراچی چلے گئے جہاں پر اُن کے دوست غنی سرور خان آف مغلکو موجود تھے۔ جنہوں نے وہاں پر ان کا بہت خیال رکھا۔ اُن کی والدہ اُن کی جدائی میں بہت بے چین تھی وہ چپکے سے اُن کے دیرینہ دوست اور غنی سرور خان کے رشتہ دار شمس الدین خان آف جمال گڑھی کے گھر گئیں اور انہیں کراچی بھیجا تا کہ وہ والدصاحب کو واپس لے آئے بعدازاں شمس الدین خان اُن کو واپس لانے میں کامیاب رہے۔

والدصاحب اپنی والدہ محترمہ سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کا بہت خیال بھی رکھتے تھے لیکن ایسا کرنے کا اُن کا اپنا انداز تھا وہ کسی کے لئے اپنے حقیقی جذبات کا اظہار لوگوں کے سامنے بہت کم کرتے تھے۔ اُن کی والدہ کو بھی ان سے اتنی محبت تھی اور ان سے اتنی خوش تھی کہ ساری عمر ان کے ساتھ گزاری۔ یہ ٹھیک ہے کہ والدصاحب کی طبیعت سخت تھی اور وہ گھر میں کبھی کبھار غصے میں آجاتے تھے لیکن ایسی لغزشوں سے ساری مائیں ہمیشہ درگزر کرتی رہتی ہیں۔ میں نے اپنے والد کو زندگی میں سب سے زیادہ رنجیدہ حالت میں اُس وقت دیکھا تھا جب اُن کی والدہ کا 1977ء میں انتقال ہوا تھا۔ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے کہ انہوں نے اپنی والدہ کو اس طرح خوش نہیں رکھا جتنی اُن کی خواہش تھی لیکن اس کا ازالہ انہوں نے اس طرح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ساری عمر ان کے لئے دُعائیں کرتے رہے اور اُن کے نام پر صدقہ وخیرات کرتے رہے۔

والدصاحب کو اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے بہت محبت تھی اور اُن کی بہت قدر کرتے تھے۔ اُن کے بھائیوں کو بھی اُن سے بہت محبت تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ ان تینوں کے درمیان جائیداد کے معاملے میں کبھی کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔ چونکہ والدصاحب عمر میں اپنے بھائیوں سے بہت چھوٹے تھے اس لئے اُن کے ساتھ بیٹھنے یا اُن کے سامنے زیادہ باتیں کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ انہیں اگر اپنے بھائیوں سے کچھ کہنا ہوتا تو لکھ کر یا کسی کے ذریعے کہلوا دیتے۔ والدصاحب اپنے بڑے بھائی حاجی زرقند خان کے بہت معترف تھے اور اکثر کہا کرتے

تھے کہ حاجی صاحب ایک بہادر اور دریا دل انسان تھے وہ والد صاحب سے ہمیشہ شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

اُن کے دوسرے بھائی ملک صنوبر خان ایک نیک، پابندِ صوم وصلوٰۃ اور شریف النفس انسان تھے۔ اگر چہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے کی قدر بھی کرتے تھے لیکن دونوں کے آپس کے تعلقات بہت زیادہ قریبی نہیں تھے اور دونوں ایک دوسرے سے شاکی رہتے تھے۔ اُن کے تعلقات میں اس تناؤ کی بنیادی وجہ نہ تو مال و جائیداد تھی اور نہ کوئی خاندانی مناشقت بلکہ اُن دونوں کی طبیعتوں کا فرق تھا۔ ملک صنوبر خان کو والد صاحب سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ لوگوں پر فضول پیسے خرچ کرتے ہیں اور اپنی زمینوں کا خیال نہیں رکھتے۔ دراصل ملک صاحب پیسے خرچ کرنے میں کفایت شعاری کے قائل تھے اور والد صاحب اس معاملے میں شروع سے ہاتھ کھلا رکھنے کے عادی تھے۔ والد صاحب کو ملک صاحب سے یہ شکایت تھی کہ وہ ہر وقت اپنی صحت کے متعلق مختلف وسوسوں کا شکار رہتے تھے۔ والد صاحب کے مطابق وہ ملک صاحب کی وجہ سے ڈاکٹروں سے الرجک ہو گئے تھے کیونکہ انہوں نے بہت وقت ملک صاحب کے ساتھ ڈاکٹروں کے کلینک یا ہسپتال میں گزارا۔ اب جب میں سوچتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ملک صاحب حقیقت میں نفسیاتی بیماری کا شکار تھے اور اُنہیں یہ غلط فہمی تھی کہ وہ کسی جسمانی بیماری خصوصاً گردے کی بیماری کا شکار تھے لیکن افسوس کہ اُن کی صحیح تشخیص اور علاج نہ ہو سکا اور ان کی ساری زندگی اس تکلیف اور پریشانی میں گزر گئی۔

والد صاحب اپنی بہنوں سے بھی بہت محبت کرتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے دراصل اُن وقتوں میں رشتوں کی بہت عزت وتوقیر کی جاتی تھی اور گھر والوں رشتہ داروں اور دوستوں سے بے لوث محبت کی جاتی تھی۔ والد صاحب نے اپنی بڑی بہن (والدہ ابراہیم گل، محمد نواس) کے شوہر کے انتقال کے بعد اُن کے ساتھ موضع کنج میں تین چار سال گزارے۔ اُن کی بہنوں کو بھی اُن سے بلکہ اپنے سب بھائیوں سے بہت محبت تھی۔

تعلیم :

والد صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کاٹلنگ میں حاصل کی۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ میٹرک کرنے لوندخوڑ چلے گئے جہاں پر وہ دو سال مقیم رہے کیونکہ کاٹلنگ میں اُن دنوں میٹرک کی کلاسیں نہیں ہوتی تھیں۔ سکول میں اُن کے ہم جماعتوں میں صادق روز ہیڈ ماسٹر صاحب، عبدالحکیم اُستاد، عبدالرحمٰن اُستاد اور اکبر علی خان جو رشتے میں اُن کے بھانجے تھے قابل ذکر ہیں۔ میٹرک کرنے کے بعد انہوں نے ہمارے صوبے کی مشہور درسگاہ اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ لیا یہ 1951 کی بات ہے۔ والد صاحب نے اسلامیہ کالج سے ایف ایس سی کیا اور بی ایس سی کا کورس بھی مکمل کیا لیکن اس کا امتحان کسی وجہ سے پاس نہ کر سکے۔ وہاں پر جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد اور سابق گورنر بیرسٹر مسعود کوثر بھی اُن دنوں زیرِ تعلیم تھے۔ والد صاحب بتاتے تھے کہ انگریزی کے پروفیسر اور مشہور شاعر داؤد کمال اُن سے ایک کلاس سینئر تھے اور انہوں نے خیبر یونین کے صدر کا انتخاب لڑا تھا۔ داؤد کمال صاحب اگرچہ بہت قابل تھے لیکن ان کو الیکشن میں اس لئے شکست ہوئی تھی کیونکہ اُن کی تقریر اتنی اچھی نہیں تھی۔ انگریزی کے مشہور پروفیسر اور مصنف ایچ ایم کلوز ان کے استاد رہے۔ مشہور ماہر تعلیم عبدالعلی خان، ڈاکٹر عبدالمتین اور ڈاکٹر انور خان بھی اُن دنوں اسلامیہ کالج میں پڑھاتے تھے۔ یہ تینوں بعد میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

کالج کے پہلے سال میں والد صاحب کی کارکردگی بہت اچھی تھی لیکن بعد میں لگتا ہے کہ اُن کی غیر نصابی سرگرمیاں زیادہ ہوگئیں اور وہ پڑھائی پر اتنی توجہ نہ دے سکے۔ چونکہ اُنہیں دوست بنانے اور گپ شپ لگانے کا بہت شوق تھا اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت دوستوں کے ساتھ گزارتے تھے۔ والد صاحب سکول اور کالج کے دنوں میں کھیلوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور والی بال اور اتھلیٹکس کے اچھے کھلاڑی تھے۔ اُن کے والی بال کا شوق

بعد میں بھی جاری رہا اور کافی عرصہ تک گاؤں میں بھی یہ کھیل کھیلتے رہے۔ جب وہ اسلامیہ کالج سے واپس آئے تو کچھ عرصہ گورنمنٹ ہائی سکول کاٹلنگ میں بطور اُستاد سائنس پڑھاتے رہے لیکن بعد میں یہ نوکری چھوڑ دی کیونکہ اُن کی دلچسپی سیاست سے پیدا ہوگئی تھی۔

شادی:

یار قند خان کی شادی تحریک آزادی کے عظیم رہنما اور ملک کے مشہور سیاستدان خان غلام محمد خان آف لوند خوڑ کی دختر سے 1967ء میں ہوئی۔ خان غلام محمد خان اپنے عہد کی بہت بڑی شخصیت تھے اور عوامی سطح پر بہت مقبول تھے۔ وہ صوبہ سرحد میں کانگریس پارٹی کے سرکردہ رہنما رہے اور پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ اُن کے کانگریس کے سرکردہ رہنماؤں جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس اور مولانا عبدالکلام آزاد سے ذاتی تعلقات تھے۔ بعد میں اُن کا عبدالغفار خان عرف باچا خان سے پارٹی کے مالی معاملات پر اُصولی اختلاف ہوا اور وہ کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ خان غلام محمد خان ایک سیماب صفت انسان تھے اور انقلابی اور جذباتی طرزِ سیاست کو پسند کرتے تھے اور کبھی جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے نہیں کتراتے۔ اُن کی یہ روش مسلم لیگ میں بھی جاری رہی اور انہیں تھوڑے عرصے بعد صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان کے ہاتھوں صوبہ بدر ہونا پڑا۔ اپنے کانگریس کے دنوں میں بھی اُن کا جھکاؤ مہاتما گاندھی کی بجائے مشہور انقلابی رہنماء سبھاش چندر بوس کی طرف رہا۔

والد صاحب کہتے تھے کہ اُن کے بڑے بھائیوں حاجی زر قند خان اور ملک صنوبر خان کے خان غلام محمد خان سے ذاتی اور سیاسی تعلقات تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ اُن کی شادی خان صاحب کے خاندان میں ہو۔ جنرل ایوب خان کے دور میں جب بلدیاتی انتخابات ہوئے تو والد صاحب اس میں کامیاب ہوئے اور یونین کونسل کاٹلنگ کے پہلے چیئرمین منتخب ہوئے۔

اسی مناسبت سے بعد میں لوگ انہیں ''چیئر مین صیب'' کے نام سے پکارنے لگے اور یہ سلسلہ ساری عمر جاری رہا۔ انہی دنوں خان غلام محمد خان نے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ اُن انتخابات میں یونین کونسل کے ممبران قومی اسمبلی کا حلقۂ انتخاب ہوتے تھے۔ انتخابات میں خان غلام محمد خان کو شکست ہوئی کیونکہ ان کے مخالف امیدواروں نے پیسے دے کر ممبران سے ووٹ خریدے۔ خان صاحب نے کہیں ذکر کیا کہ یارقند خان نے بھی اُن کو ووٹ نہیں دیا ہے۔ والد صاحب کو جب پتہ چلا تو انہیں بہت غصہ آیا اور اپنے بڑے بھائی حاجی زرقند خان کو ساتھ لے کر لوندخوڑ چلے گئے اور خان صاحب کے سامنے اس بات پر بھرپور احتجاج کیا کہ آپ نے میری وفاداری کو شک کی نظر سے کیوں دیکھا۔ خان غلام محمد خان نوجوان یارقند خان کی باتیں سن کر حیران رہ گئے کیونکہ بہت کم لوگ اُن کے سامنے اس لہجے میں بات کرنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ خان صاحب اس موقع پر تو خاموش رہے لیکن بعد میں جب یارقند خان کا رشتہ اُن کی دختر کے لئے آیا تو انہوں نے کہا کہ وہ لڑکا تو بہت باتونی اور غصیلا ہے لیکن ساتھ ہی رشتہ بھی قبول کر لیا۔ لگتا ہے کہ انہیں والد صاحب کی جرأت اور بے باکی پسند آ گئی تھی۔

ہماری والدہ ایک رحم دل، نیک اور نماز گزار خاتون ہیں۔ اُنہیں قرآن شریف کی تلاوت کرنے کا بہت شوق ہے انہیں سورۂ یٰسین زبانی یاد ہے اور ہر وقت اس کی تلاوت کرتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں سورۂ مزمل اور آخری سورتیں بھی یاد ہیں۔ اگر چہ ہماری والدہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہیں لیکن انہوں نے والد صاحب کے ساتھ ہر قسم کے حالات میں گزارا کیا۔ بدقسمتی سے ہماری والدہ بہت عرصے بیمار رہیں اور انہیں بے ہوشی کے دورے پڑتے رہے انہیں پہلا دورہ 1974ء میں اپنے والد خان غلام محمد خان کی وفات کے بعد پڑا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ وقفوں کے ساتھ جاری رہا۔ اُن کا بہت علاج کیا گیا لیکن صحیح تشخیص نہ ہوسکی۔ تقریباً بیس سال بعد اُن کی بیماری کی تشخیص ہوسکی اور پتہ چلا کہ اُن کو مرگی کا مرض ہے اور مرگی کی بنیادی وجہ برین ٹیومر (Brain Tumour) ہے۔ اس کے بعد اُن کا علاج شروع ہوا اور اُن کے

دورے بند ہو گئے لیکن اس لمبی بیماری نے والدہ صاحبہ کو جسمانی اور نفسیاتی طور پر بہت متاثر کیا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کی سیاست نے بھی اُن کی صحت کو متاثر کیا۔ ایک سیاست دان کے گھر والوں خصوصاً اُس کے گھر کی عورتوں کو ان کی سیاست کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے کیونکہ اُن کی ساری عمر مہمانوں کی خدمت میں گزر جاتی ہے اور ہماری والدہ کے تو والد اور شوہر دونوں سیاست دان تھے۔

ہماری والدہ کی صحت آج کل کافی خراب ہے لیکن ہمارے اصرار کے باوجود وہ کاٹلنگ میں واقع ہمارے آبائی گھر کو چھوڑنے پر تیار نہیں اور وہاں رہتے ہوئے زیادہ اطمینان محسوس کرتی ہیں۔ ہمارے پڑوس کے لوگ جن میں سے اکثر ہمارے رشتہ دار ہیں بھی اُن کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہماری والدہ کی یہ روش اُن کے اپنے انداز میں اپنے مرحوم شوہر سے اُن کی وفاداری کا مظہر ہے اور ان کے اس اصول پر پختہ یقین کا آئینہ دار ہے کہ شادی کے بعد عورت کی جسد خاکی ہی اُس کے شوہر کے گھر سے نکلنی چاہیے۔

والد صاحب کے ہمارے بڑے ماموں فدا محمد خان آف لوندخوڑ کے ساتھ بہت قریبی تعلقات تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اختلاف بھی رکھتے تھے اور بحث بھی کرتے تھے لیکن ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور ایک دوسرے کی قدر بھی بہت کرتے تھے۔

سیاسی سرگرمیاں:

والد صاحب کی زندگی کا ایک بہت بڑا اور قابل ذکر حصہ کوچۂ سیاست کی جادہ پیمائی میں گزرا۔ وہ سیاست کو عبادت سمجھ کر کرتے اور اسے ذاتی اور خاندانی منفعت کے لئے زینہ کے طور پر استعمال کرنے کے خلاف تھے۔ وہ عملی سیاست کے ساتھ ساتھ فکری اور نظریاتی سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور اس سلسلے میں غور وحوض کرتے رہتے تھے۔ اُن کی سیاست کے تین رہنما اُصول تھے جن پر وہ سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں تھے اور کسی جماعت یا فرد کی جانچ

پڑتال اُن کے اصولوں کے مطابق کرتے تھے۔ اُن کے تین رہنما اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام پسندی ۲۔ حب الوطنی ۳۔ خدمت خلق

وہ سیاست میں معاشرتی اور ریاستی سطح پر اسلام سے رہنمائی لینے کے اصول کے قائل تھے اگر چہ وہ اس سلسلے میں متشدد نہیں تھے لیکن اسلام کو اپنی اولین پہچان تصور کرتے تھے۔ وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے اور ہر فرد یا جماعت کو اسی پیمانے پر ناپتے تھے۔ اُن کی حب الوطنی کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ اپنی بیماری کے دوران انہوں نے بازار میں دستیاب سستی دوا کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ انڈیا سے سمگل ہو کر آئی ہے اور پاکستان کو اقتصادی طور پر نقصان پہنچا رہی ہے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ سیاست کا مقصد عوام کی خدمت ہے۔ ان تینوں دائروں کے اندر رہتے ہوئے اُن کی پسند یا ناپسند میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی تھی۔

جہاں تک عملی سیاست کا تعلق ہے تو وہ بنیادی طور پر ایک عوامی آدمی تھے اُن کی طرزِ زندگی ایک عام آدمی سے مختلف نہیں تھی۔ خان غلام محمد خان لوند خوڑ کا داماد ہونے اور سیاسی طور پر ان کے زیر سایہ رہنے کی وجہ سے ان کی بنیادی پہچان ایک مسلم لیگی کی رہی۔ اُن کی وفات کے بعد وہ عبدالقیوم خان، محمد خان جونیجو اور نواز شریف کی مسلم لیگ کا حصہ رہے اور سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے صوبائی اسمبلی کا اپنا پہلا انتخاب مسلم لیگ کے ٹکٹ پر 1977ء میں لڑا۔ اس موقع پر قومی اسمبلی کے انتخابات کے بعد اپوزیشن PNA نے صوبائی الیکشن کا بائیکاٹ کیا چونکہ مسلم لیگ بھی اپوزیشن کا حصہ تھی اس لئے والد صاحب نے بھی الیکشن کا بائیکاٹ کیا اور بعد میں مارشل لاء لگ گیا۔

انہوں نے دوسری دفعہ انتخاب 1985ء میں لڑا۔ اس دفعہ الیکشن غیر جماعتی بنیادوں پر ہوئے اس الیکشن میں زبردست دھاندلی کے باوجود والد صاحب چھ سو ووٹوں کی قلیل تعداد سے ہارے تھے۔ اس الیکشن میں میاں خان، سنگاہو اور بابوزئی وغیرہ میں اتنی

دھاندلی ہوئی تھی کہ صرف اُن ووٹروں کی تعداد پچیس سو سے اوپر تھی جو یا تو فوت ہو چکے تھے اور یا ملک سے مزدوری کے سلسلے میں باہر تھے۔ صرف ایک پولنگ سٹیشن پر ایک پریزائیڈنگ افسر نے اپنے ہاتھ سے پانچ سو سے اوپر ووٹ اپنے علاقہ کے امیدوار کے حق میں ڈالے اور فخر سے کہا کہ یہ میری طرف سے ایک تحفہ ہے۔ اُن کے مخالف امیدوار نے اپنے تقریباً سارے ووٹ میاں خان، سنگاہو اور بابوزئی سے حاصل کئے جبکہ والد صاحب نے پورے حلقے سے ووٹ حاصل کئے۔

1988ء کا انتخاب والد صاحب نے اسلامی جمہوریہ اتحاد کے پلیٹ فارم سے لڑا اور ایک سخت مقابلہ کے بعد اے این پی کے منور خان سے آٹھ سو ووٹوں سے ہارے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں آٹھ سو ووٹوں کی اکثریت اتنی زیادہ تصور نہیں کی جاتی۔

والد صاحب نے اپنا آخری الیکشن 1990ء میں لڑا اگرچہ اُنہیں اس الیکشن میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود انہوں نے آزاد حیثیت میں ساڑھے پانچ ہزار سے زیادہ ووٹ لئے۔ اس کے بعد بھی وہ سیاست میں سرگرم رہے لیکن مختلف وجوہات کی بناء پر الیکشن لڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

اگر میں یہ کہوں کہ یارقند خان اس علاقہ کے سب سے مقبول رہنما تھے تو یہ کچھ زیادہ غلط نہیں ہوگا کیونکہ اُن کا زیادہ تر ووٹ بینک اُن کی ذاتی شخصیت اور تعلقات کی وجہ سے تھا۔ اور اس میں جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ کا حصہ قلیل تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اے این پی ہمارے حلقہ کی سب سے مضبوط جماعت تھی اور اس کے بعد پیپلز پارٹی کا نمبر آتا تھا اور مسلم لیگ کی پوزیشن اتنی مضبوط نہیں تھی۔

جب میں معروضی طور پر اپنے والد کی سیاست کا جائزہ لیتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ الیکشن میں اُن کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ پاور پالیٹکس سے اتنے بلد نہیں

تھے۔ پاور پالیٹکس کا مطلب ہے ضلعی ،صوبائی اور ملکی سطح پر سیاست کا جائزہ لینا، سیاسی فضا کا رخ جانچنا، علاقائی سطح پر ایسے اتحاد قائم کرنا کہ آپ کی پوزیشن مضبوط ہو اور آپ کے مخالف کمزور ہوں اور صوبائی اور قومی سطح کے رہنماؤں سے قریبی تعلقات رکھنا وغیرہ۔ یہ عملی سیاست کا وہ رخ ہے جو اگر چہ اتنا پسندیدہ نہیں لیکن جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ والد صاحب اپنی سادہ طبیعت اور خلوص کی وجہ سے اس قسم کی سیاست کے لئے زیادہ موزوں نہیں تھے۔ مثال کے طور پر 1985ء میں تین دن پہلے ہونے والے قومی انتخاب میں میاں خان، سنگا ہو اور بابوزئی وغیرہ کے لوگوں نے اپنے علاقہ کے امیدوار کے حق میں اسی طرح دھاندلی کی تھی لیکن والد صاحب اس کی پیش بینی نہ کر سکے کہ صوبائی انتخابات میں ایسا نہ ہو۔ 1988ء میں ہر پارٹی کی خواہش تھی کہ والد صاحب ان کے ٹکٹ پر انتخابات لڑیں کیونکہ وہ بہت مقبول تھے اور ایک دیانتدار انسان تصور کئے جاتے تھے لیکن انہیں غلط فہمی کی وجہ سے یہ خدشہ تھا کہ کوئی بڑی پارٹی انہیں اس وجہ سے ٹکٹ نہیں دے گی کیونکہ انہوں نے 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ 1993ء میں انہیں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کا مشترکہ ٹکٹ صرف اس وجہ سے نہیں مل سکا کیونکہ اس وقت ان کے مرحوم میر افضل خان سے تعلقات نہیں تھے اور انہوں نے مسلم لیگ میں ایک نو وارد کو ٹکٹ دے دیا۔ اگر چہ بعد میں ان کے میر افضل خان سے قریبی تعلقات استوار ہوئے لیکن جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

ہمارے صوبائی حلقہ کی سب سے مضبوط جماعت اے این پی کی طرف سے کئی بار کوشش کی گئی کہ والد صاحب اس میں شامل ہوں لیکن انہوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اُن کے دوست اور نامور اسکالر اور گلوکار سردار علی ٹکر کے بھائی مشال خان نے والد صاحب کو 1988ء کے انتخابات سے پہلے یہ پیشکش کی کہ اگر وہ اے این پی میں شامل ہونے کو تیار ہو جائیں تو وہ خان عبدالولی خان کو بذات خود کاٹلنگ لانے کو تیار ہیں۔

یہ چند مثالیں میں نے تاریخی ریکارڈ کے لئے بیان کی ہیں ورنہ بعد میں تو والد

صاحب بار بار یہ کہتے کہ اُن کی ناکامی میں اللہ تعالیٰ کی بڑی مصلحت تھی اور وہ اس پر بہت خوش اور مطمئن ہیں کیونکہ کامیابی کی صورت میں ہوسکتا تھا کہ اُن سے غلط کام سرزد ہوجاتے یا وہ کسی کو اس کے حق سے محروم کرتے اس لئے یہ اُن پر اللہ کی مہربانی ہے کہ انہیں ان چیزوں سے دور رکھا۔ اپنے سیاسی کیریئر کے دوران ان کے عبدالقیوم خان، سابق گورنر فضل حق، سابق وزیراعلیٰ میر افضل خان اور آفتاب شیر پاؤ وغیرہ کے ساتھ تعلقات تھے۔ وہ فضل حق صاحب کی دلیری اور میر افضل خان کی سخاوت کے معترف تھے۔

ملکی سطح پر وہ قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال اور ذوالفقار علی بھٹو کے مداح تھے۔ وہ ذکر کرتے تھے کہ قائداعظم اور علامہ اقبال کے دل میں برصغیر کے مسلمانوں کا درد بھرا ہوا تھا اور انہوں نے اپنی ساری زندگی مسلمانوں لئے ایک الگ خودمختار وطن حاصل کرنے کے لئے وقف کی تھی۔ قیامِ پاکستان اور مسلمانوں کی قربانیوں کی باتیں کرتے ہوئے بعض اوقات فرطِ جذبات سے اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ یہ وہ کہتے تھے کہ پاکستان کے بانیوں نے اپنا کام سرانجام دے دیا ہے اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم پاکستان کو کیسے چلاتے ہیں۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی قائدانہ صلاحیتوں کے معترف تھے اور پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کو ان کا عظیم کارنامہ تصور کرتے تھے۔ وہ کسی زمانے میں جماعت اسلامی سے بھی متاثر تھے اور مولانا مودودیؒ کی کتابیں شوق سے پڑھتے تھے۔

90 کی دہائی کے آخری سالوں میں انہوں نے عملی سیاست سے آہستہ آہستہ کنارہ کشی اختیار کرلی۔ سیاسی لوگ ان کے پاس آتے تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ اب میں جسمانی طور پر کمزور ہوگیا ہوں اس لئے عملی سیاست نہیں کرسکتا۔ پرویز مشرف کے دور میں جب اجمل خٹک اے این پی سے الگ ہوئے اور انہوں نے اپنی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اپنے قریبی ساتھی اور مصنف جمعہ خان صوفی کے ذریعہ والد صاحب سے رابطہ کیا۔ اس واقعہ کو جمعہ خان صوفی نے اپنی مشہور کتاب ''فریب ناتمام'' میں بیان کیا ہے۔ جمعہ خان صوفی رقم طراز

ہیں۔

''کاٹلنگ میں مسلم لیگی حاجی یارقند سے ملے، اچھا آدمی تھا۔ دلاور شاہ کے بارے میں سفارش کی کہ نیپ کو چاہیے کہ اسے ٹکٹ دے۔ اجمل خٹک کے بارے میں بتایا کہ بوڑھا آدمی ہے اور اس کی پارٹی کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ دلاور شاہ نے اسے کمرے سے باہر بلایا اور بتایا کہ صوفی کو اصل میں اجمل خٹک نے بھیجا ہے کہنے لگے کہ میں نے سیاست چھوڑ دی ہے۔ اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو سوچوں گا۔''

ان دنوں وہ ساولڈھیر کے دلاور شاہ خان کے حامی تھے جو ایک نہایت شریف اور دیانتدار انسان ہیں۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ وہ عملی سیاست میں آئیں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ایسا نہیں ہو سکا۔

سماجی خدمات:

والد صاحب میں خدمتِ خلق کا جذبہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کو یہ جذبہ اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا تھا کیونکہ ان کے بزرگوں نے بھی اپنے علاقہ کے عوام کے لئے بہت خدمات سرانجام دی تھیں۔ والد صاحب ہمیشہ اپنے علاقے کے مسائل سے باخبر رہتے تھے اور انہیں حل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے سیاست میں آنے کا ایک بڑا مقصد عوام کی خدمت اور اپنے علاقے کو ترقی دینا تھا۔ وہ مختلف سماجی برائیوں مثلاً جوا، منشیات وغیرہ کے سخت خلاف تھے اور ان برائیوں کے سدباب کے لئے علاقہ کے معززین کے ساتھ مل کر کوشش کرتے تھے۔ ان کا سارا دن لوگوں کے تھانہ وکچہری کے مسائل حل کرنے اور ان کے تنازعات کا تصفیہ کرنے میں گزرتا تھا۔ وہ لوگوں کی غمی اور خوشی میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

1980ء کی دہائی میں وہ پورے علاقہ کی اصلاحی کمیٹی کے سربراہ تھے۔اس کمیٹی میں کاٹلنگ اور ارد گرد کے علاقوں کے مندرجہ ذیل معززین شامل تھے۔مولانا بحرالعلیم المعروف بحر حاجی صیب، حافظ سلطان محمود، حاجی رحمت شاہ ساولڈھیر، حاجی سربلند خان جمال گڑھی، توفیق خان ایڈوکیٹ (سابقہ ممبر صوبائی اسمبلی)، حاجی شمس القمر خان، عبدالرشید خان، حاجی وارث خان آف کوہی برمول اور نجیم خان۔ یہ سارے اپنے وقت کے نامی گرامی لوگ تھے۔ اصلاحی کمیٹی کا ہر مہینے اجلاس ہوتا تھا اور اس کی کاروائی باقاعدہ لکھی جاتی تھی۔ میں نے والد صاحب کے کاغذات میں اس کمیٹی کی کاروائیاں دیکھی ہیں جس میں لوگوں کے تنازعات پر بحث ہوتی تھی اور ان کے درمیان تصفیہ ہوتا تھا۔ یہ کمیٹی پورے علاقہ میں لوگوں کے درمیان متنازعہ مسائل کوحل کرتی تھی۔ یہ کمیٹی اتنی موثر تھی کہ لوگ باقاعدہ درخواست لکھ کر کمیٹی سے اپیل کرتے تھے کہ اُن کے تصفیہ طلب امور کوحل کیا جائے۔کمیٹی مخالف فریقین کو بُلا کر اُن کا موقف سنتی اور پھر فیصلہ کرتی۔اس اصلاحی کمیٹی کو انتظامیہ کی بھی بھرپور مدد حاصل تھی۔

مذہبی خیالات:

والد صاحب کا اللہ تعالیٰ پر ایمان اور توکل بہت مضبوط تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے زندگی بھر اپنی حفاظت کے لئے کوئی محافظ نہیں رکھا اور ہمارے گھر میں اسلحہ نام کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ اُن کا سامنا ڈاکوؤں سے ہوا لیکن اُنہوں نے والد صاحب کو پہچان کر نہ صرف اُن کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ بہت عزت سے پیش آئے۔ وہ عشقِ رسول ﷺ سے سرشار تھے اور اس جذبے کو ایمان کی کسوٹی سمجھتے تھے۔ وہ اولیائے کرام سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور اُن کے مزارات پر جانا پسند کرتے تھے۔ وہ علماء اور نیک لوگوں کی بہت قدر کرتے تھے اور اُن کی خدمت کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ وہ میرے اُستاد اور مربی حافظ فضل مالک صاحب سے اکثر کہتے کہ اُنہیں اس بات پر بہت خوشی اور

اطمینان ہے کہ اُن کے بیٹے کے آپ جیسے نیک بندے کے ساتھ تعلقات ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیں سیدھی راہ پر چلنے کی تلقین کرتے تھے اور ہمارے نیک عمل سے بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ خود نماز پڑھنے میں اکثر سستی برتتے تھے۔ میں انہیں اکثر کہا کرتا تھا کہ آپ میں یہ بہت بڑی کمی ہے اور وہ کھلے دل سے اس کا اعتراف بھی کرتے تھے اور کہتے کہ وہ آئندہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی کوشش کریں گے لیکن پھر اس بات کو بھول جاتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اُن پر بڑی مہربانی تھی کہ بعد میں وہ پانچ وقت نمازی بن گئے۔ اپنے آخری دنوں میں انہیں اس کی بہت فکر لاحق تھی کہ اُن سے جو نمازیں رہ گئی تھیں اُن کو کس طرح ادا کیا جائے یا اُن کا کیا کفارہ ادا کیا جائے۔

ایک والد کی حیثیت سے:

ہمارے والد جنہیں ہم سب بہن بھائی ''داجی'' کہہ کر پکارتے تھے ایک شفیق باپ تھے۔ وہ ہم سے بہت محبت کرتے تھے اور ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ ہماری تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے اگرچہ وہ ہر کسی سے نرم رویہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن بنیادی طور پر وہ نسبتاً سخت طبیعت کے مالک تھے اور بچپن میں ہماری بعض شرارتوں پر ہمیں کبھی کبھار سزا بھی دیتے تھے۔ اُن کا رویہ ہمارے ساتھ بہت دوستانہ ہوتا تھا لیکن ہم دل میں اُن سے کافی ڈرتے بھی تھے۔

وہ اپنی تینوں بیٹیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن سے اکثر اوقات گپ شپ لگاتے اور اُن کی ہر قسم کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ داجی اپنی سخت طبیعت کے ساتھ ساتھ نرم دل بھی بہت تھے۔ اپنی بیٹیوں کی شادی کے موقع پر اُنہیں رخصت کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ اُن کی بیٹیاں بھی اُن سے بہت محبت کرتی تھیں اور اُن کی خدمت کر کے خوش ہوتی تھیں۔

میں اپنے والد صاحب کا بہت لاڈلہ تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اُن کی جان مجھ میں تھی تو

یہ مبالغہ آرائی نہیں ہوگی ۔ مجھے بعض اوقات یہ محسوس ہوتا کہ وہ میرے لئے جی رہے ہیں اور اُن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ میں ایک کامیاب انسان بن جاؤں اور خوش وخرم اور کامیاب زندگی گزاروں ۔ داجی کی دُنیاوی خواہشات بہت کم تھیں میری بہنوں کی شادی کے بعد اُن کی دلچسپیوں کا محور میری ذات رہ گئی تھی ۔ میری تعلیم ، میری نوکری ، میری شادی اور میری ضروریات اُن کی زندگی کا واحد مسئلہ رہ گئی تھی اور وہ اسے اپنی زندگی میں احسن طریقے سے حل کرنا چاہتے تھے ۔

میں نے اپنی زندگی میں تین موقعوں پر اُنہیں سب سے زیادہ خوش دیکھا ۔ پہلی دفعہ جب مجھے نوکری ملی ، دوسری دفعہ جب میری شادی ہوئی اور تیسری دفعہ جب میرے پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی ۔ ان مواقع پر وہ خوشی سے پھولے نہیں ساتے تھے ۔ اُن کی وفات کے وقت اگر انہیں اپنی آخرت کے علاوہ اور کوئی فکر تھی تو وہ میری تھی ۔ انہوں نے اپنے تمام دوستوں کو یہ کہا ہوا تھا کہ میرے بعد میرے بیٹے کا بہت خیال رکھنا ہے ۔

اپنی اولاد سے محبت کرنا اور اُن کے اچھے مستقبل کے لئے تگ ودو کرنا تو ہر والد اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے ۔ جو چیز داجی میں منفرد تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنی اولاد سے یہ طمع بھی نہیں رکھتے تھے کہ وہ اُن کی خدمت کرے یا اُن کی مدد کرے ۔ خدمت تو دور کی بات وہ مجھ سے چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کروانا چاہتے تھے ۔ وہ اپنا ہر کام خود کرنے کے عادی تھے اور کسی پر حتیٰ کہ اپنے بیٹے پر بھی ، بوجھ بننا نہیں چاہتے تھے ۔ اُنہیں اوروں پر احسان کر کے تو خوشی محسوس ہوتی تھی لیکن خود کسی کے زیرِ احسان رہنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ وہ میرا اتنا خیال رکھتے تھے کہ بعض اوقات مجھے غصہ آجاتا تھا کہ آخر آپ میرے والد ہیں اور میں آپ کا بیٹا ہوں مجھے بھی کچھ خدمت کرنے کا موقع دیں ۔ آخر لوگ یہ سب دیکھ کر کیا کہیں گے لیکن اس کے باوجود وہ اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتے تھے ۔

جب میں ایف ایس سی کے دوران نثار شہید کالج رسالپور میں اور بعد میں خیبر

میڈیکل کالج پشاور میں پڑھتا تھا تو داجی کا معمول تھا کہ باقاعدگی سے ہر ہفتہ بدھ کے دن مجھ سے ملنے آتے اور میرے لئے گھر سے کھانا اور فروٹ لاتے۔ اُن کا یہ معمول برسوں جاری رہا حالانکہ میں ہر ہفتے گھر آتا تھا۔ اس وجہ سے ہاسٹل میں مشہور ہوگیا تھا کہ میرے کمرے میں ہر وقت خوراک کی چیزیں موجود ہوتی تھیں۔

داجی میرے ساتھ سیاست سے لے کر گھریلو مسائل تک سب موضوعات پر گفتگو کرتے تھے اور مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ میں بعض چیزوں پر اُن سے اختلاف بھی کرتا تھا اور اُن سے بحث بھی کرتا تھا۔ وہ اس پر خفہ نہیں ہوتے تھے بلکہ میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اُن کے قریبی دوست جانتے ہیں کہ اگر کوئی اُن کے سامنے اُن کی طبیعت کے خلاف بات کرسکتا تھا تو وہ میں ہی تھا۔

داجی کی بہت بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بن کر دُکھی انسانیت کی خدمت کروں۔ جب میں مریضوں کا علاج کرتا تھا تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی میرے بارے میں یہ نہیں سوچا کہ میں عملی سیاست میں حصہ لوں۔ اُن کے اس طرزِ عمل کی جو منطق میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدمتِ خلق کو سیاست پر فوقیت دیتے تھے۔ وہ سیاست کو بھی عوام کی خدمت کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے لیکن اس کو پیشہ بنانے کے حق میں نہیں تھے۔

داجی مجھے ڈاکٹر تو بنانا چاہتے تھے لیکن خود ساری عمر ڈاکٹروں سے دور رہنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ بیماری میں بھی بہت کم ڈاکٹروں کے پاس جاتے تھے۔ وہ حکیمی علاج اور گھریلو نسخوں پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ حکیمی دوائیں میٹھی ہوتی ہیں اس لئے اچھی ہوتی ہیں۔

اُن کی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ وہ اپنے مال مویشیوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور اُن کے لیے چارے کا بندوبست خود اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے اور اُن کی جگہ کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھار جب وہ فارغ ہوتے

تو مویشیوں کو باہر چرانے کے لئے بھی لے جاتے تھے۔

سفرِ حج:

2003ء میں والد صاحب کو پراسٹیٹ (Prostate) کی تکلیف ہوئی اور انہیں مجبوراً آپریشن کرنا پڑا۔ اسی دوران اُن کے قریبی دوست سلیم خان آف جمال گڑھی اور گل سید شاہ خان اُن کے ساتھ ہسپتال میں موجود تھے۔ وہ دونوں تبلیغی جماعت کے رکن بن چکے تھے اور والد صاحب کو بھی وقتاً فوقتاً دین کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اُن سے کہتے تھے کہ آپ نے ساری عمر لوگوں کو خوش کرنے میں گزار دی ہے اب وقت آ گیا ہے کہ آپ اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کریں۔ والد صاحب اُن سے بحث کرتے کہ لوگوں کو خوش کرنا بھی اللہ کو خوش کرنے کے برابر ہے۔ وہ کہتے کہ یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ شریعت پر عمل کریں اور نماز کی پابندی کریں۔ والد صاحب اُن سے اُصولی اتفاق کرتے لیکن عملی طور پر اپنے رویے میں تبدیلی لانے میں تاخیر کا شکار رہتے۔ آپریشن کی سختی سے گزرنے کی وجہ سے اور اُن دونوں کی ترغیب دلانے پر والد صاحب نے فیصلہ کرلیا کہ وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق داڑھی چھوڑیں گے اور نماز کی پابندی کی کوشش بھی کریں گے۔

2004ء میں انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ والد صاحب کہتے تھے کہ جب وہ اپنی زندگی کا جائزہ لیتے اور اپنے اعمال کے بارے میں سوچتے تو اُنہیں بہت پشیمانی ہوتی کیونکہ حقوق اللہ کے سلسلے میں اُنہوں نے ساری عمر غفلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ ایک گناہگار انسان ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے گناہوں پر فخر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اُن پر نادم رہے۔ وہ کہتے تھے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے شرعی فرائض کی طرف بھی سنجیدگی سے توجہ دیں۔ والد صاحب اس نئی زندگی کا آغاز حج بیت اللہ سے کرنا چاہتے تھے۔ والد صاحب جب مکہ معظّمہ پہنچے اور خانہ کعبہ کی زیارت کی تو وہاں پر انہوں نے اپنی تقریباً پچاس

سالہ پُرانی عادت سگریٹ نوشی کو خیر آباد کہنے کا فیصلہ کیا۔ یکدم اتنی پرانی عادت کو چھوڑنا ایک مشکل کام تھا اور وہ بیمار ہوگئے مگر اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اس بیماری کے دوران بلکہ پورے حج کے دوران حاجی زاہد آف کھوٹی شاہ نے اُن کی بہت خدمت کی۔ والد صاحب اس وجہ سے حاجی زاہد سے بہت محبت کرتے تھے اور اُن کی بہت قدر کرتے تھے۔ اس بیماری کے دوران ڈاکٹر ایوب روز جو اُسی سال حج کے لئے گئے ہوئے تھے، بھی اُن کی عیادت کے لئے آئے اور اُنہیں دوائیں تجویز کیں۔ خوش قسمتی سے والد صاحب ایام حج سے پہلے صحت مند ہو گئے اور ارکان حج خوش اسلوبی سے ادا کئے۔

مناسک حج ادا کرنے کے بعد وہ زیارتِ رسول ﷺ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے مدینہ منورہ گئے۔ والد صاحب ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ تھے مجھے یہ معلوم کرنے کا بہت اشتیاق رہا کہ انہوں نے روضۂ مبارک پر کس طرح حاضری دی۔ اُس وقت اُن کے کیا جذبات تھے اور مدینہ منورہ میں انہوں نے اپنا وقت کیسے گزارا۔ اس کے متعلق مجھے تفصیلی معلومات نہ مل سکیں۔ مجھے اُن کی کہی ہوئی ایک بات یاد ہے کہ جب وہ روضۂ مبارک پر حاضری کے لئے جاتے تو قبرِ مبارک کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ''یا رسول اللہ! میں تو آپ کے مزار کے بہت قریب آنا چاہتا ہوں لیکن یہ محافظ مجھے نہیں چھوڑتے۔''

والد صاحب جب حج سے واپس آئے تو خوش آمدید کہنے کے لئے آنے والے تقریباً ہر مہمان سے کہتے کہ تمہارے لئے وہاں پر دعائیں کی ہیں۔ یہ سُن کر ہم تھوڑے سے حیران ہوئے لیکن میرے ماموں فدا محمد خان آف لوندخوڑ نے تو اُن کے سامنے کہا ''میں تو یہ نہیں مانتا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ تم نے اتنے لوگوں کو یاد رکھا ہو''۔ والد صاحب اُس وقت تو مسکرائے اور جواب نہیں دیا لیکن بعد میں ذکر کرتے رہے کہ وہاں پر اُن کی دعا کا طریقہ یہ تھا کہ وہ گاؤں کے ایک سرے سے شروع ہو جاتے اور گھروں کے نمبر کے حساب سے ہر گھر کے موجودہ اور فوت ہونے والے مرد و عورت ساروں کا نام لے کر اُن کے لئے دُعا کرتے تھے۔

اسی طرح جو لوگ ان کے جاننے والے تھے اور انہیں یاد تھے وہ اُن کے لئے اور اُن کے گھر والوں سب کے لئے دُعا کرتے تھے۔ اسمیں اس کی تمیز نہیں تھی کہ وہ ان کے دوست تھے یا اُن کے مخالف۔ اُن کی مغفرت کی دُعا سب کے لئے تھی۔ ہاں اپنے قریبی لوگوں کے لئے وہ خصوصی دُعا بھی کرتے تھے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا انہوں نے ہمارے ایک قریبی عزیز جن سے والد صاحب بہت خفہ تھے کے لئے بھی دُعا کی ہے وہ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر کہا۔''ہاں! میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ میں نے اُسے معاف کر دیا ہے آپ بھی اُسے معاف کریں۔''

آخری دنوں کی روداد:

والد صاحب کی صحت 2003ء کے بعد آہستہ آہستہ خراب ہونا شروع ہو گئی۔ چونکہ انہوں نے ایک طویل عرصہ سگریٹ نوشی کی تھی اس لئے انہیں سینے کی تکلیف شروع ہو گئی تھی اور اس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔ والد صاحب سب سے سستی بغیر فلٹر والی کے ٹو (K-2) سگریٹ پیتے تھے۔ میں اُن سے اکثر کہتا تھا کہ آپ تمبا کو نوشی بالکل ترک نہیں کر سکتے تو کم از کم فلٹر والی سگریٹ پئیں لیکن وہ اپنی پرانی روش پر قائم رہے۔ بعد میں انہیں سانس کی تکلیف شروع ہوئی اور اُن کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ محدود ہونے لگی۔ میں چونکہ پشاور میں مقیم تھا اس لئے والد صاحب ہم سے ملنے خصوصاً اپنے پوتوں کو دیکھنے باقاعدگی سے وہاں آتے تھے۔ اب اُن کا آنا کم ہو گیا۔ جب وہ ہمارے گھر آتے تو ہمارے اصرار کے باوجود رات کے لئے نہیں ٹھہرتے تھے۔ اب جب وہ آتے تو مجبوراً رات کے لئے ٹھہر جاتے کیونکہ کمزوری کی وجہ سے اُن کے لئے ایک دن میں آنا جانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ میرے بچوں کو گود میں اُٹھا کر پھراتے ہوئے بہت خوشی اور اطمینان محسوس کرتے تھے۔ اب ایسا کرنا اُن کے لئے مشکل ہوتا گیا کیونکہ اُن کی سانس جلد پھول جاتی۔ اپنی اس روز بروز بڑھتی ہوئی تکلیف اور کمزوری کے باوجود وہ

اپنی صحت پر بالکل توجہ نہیں دیتے تھے اور میرے پوچھنے پر وہ کہتے کہ بس ذرا سینے کی تکلیف ہے جو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہی ہے۔ اُن کی عادت تھی کہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے تھے اور کسی کے سامنے ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور پوچھنے پر ہمیشہ اُمید افزا بات کرتے کہ اب حالت پہلے سے بہت بہتر ہے یا بہتر ہو رہی ہے۔ اپنی گرتی ہوئی صحت اور میرے اس اصرار کے باوجود کہ آپ کو سینے کے سپیشلسٹ کو دکھانا بہت ضروری ہے، وہ ہسپتال آنے سے کتراتے رہے۔ اُن کے سینے کی تکلیف میں اضافہ ہوتا رہا اور اس نے ان کے دل کی رفتار کو بھی متاثر کرنا شروع کیا۔ ایک دن اُن کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ انہیں مجبوراً پشاور لا کر ہسپتال میں داخل کرنا پڑا لیکن ہسپتال میں دو تین دن علاج کے بعد اُن کے دل کی رفتار ٹھیک ہو گئی اور وہ پھر اپنے پیروں پر چلنے لگے۔

اس واقعہ کے دو تین مہینے بعد اور اپنی وفات سے تقریباً چار مہینے پہلے اُن کے رویے میں عجیب تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔ وہ قبرستان باقاعدگی سے جا کر اپنے ماں باپ کی قبروں پر حاضر ہونے لگے۔ انہوں نے اپنے والد کی قبر کی مرمت بھی کروائی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی موت کی باتیں کرنا شروع کیں اور مجھے اور اپنے دوستوں کو مختلف ہدایات دینا شروع کیں کہ اُن کی موت کے بعد کیا کیا کرنا ہے۔ وہ کہتے تھے ''میرے مرنے کا وقت بہت قریب آ گیا ہے کیونکہ میرے والدین اور دیگر بزرگ مسلسل میرے خوابوں میں آ رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔''

والد صاحب اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے کہتے تھے کہ اگر اُن کے کسی عمل یا گفتار سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو وہ معافی کے خواستگار ہیں۔ جن سے ملاقات نہ ہو سکی اُن کے متعلق یہ کہا کہ اُن سے آپ میرے لئے معافی کی درخواست کریں۔ وہ کہتے تھے کہ انہوں نے پوری زندگی کسی کا حق نہیں مارا ہے یا کسی کا مال نہیں کھایا ہے اس لئے اس معاملہ میں تو وہ مطمئن ہیں لیکن اس کے علاوہ اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو وہ معافی کے طلبگار ہیں۔

موضع کنج سے اپنے مرحوم دوست فضل عظیم خان کے بیٹے کو بلایا کہ آپ کے والد نے کنج میں میرے گھر پر جہاں وہ مقیم تھے اپنے پیسوں سے کچھ کام کیا تھا اور بعد میں جب وہ اس گھر سے جا رہے تھے تو مجھے اُن کو وہ پیسے دینا بھول گئے اس لئے مہربانی کر کے یہ دس ہزار روپے لے لیں۔ اُس کے مرحوم دوست کے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے رقم لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ''چیئرمین صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ آپ کے ہمارے اوپر بہت احسانات ہیں۔ ہم چالیس سال آپ کے گھر میں بغیر کرایہ کے رہے ہیں۔ یہ پیسے دے کر آپ ہمیں اور ہمارے مرحوم والد صاحب کو شرمندہ کر رہے ہیں۔'' اس کے باوجود والد صاحب مسلسل اصرار کرتے رہے اور انہیں مجبوراً والد صاحب کا دل رکھنے کے لئے وہ رقم لینی پڑی۔

ایک دن راستے میں ہمارے خالہ زاد اور اُن کے بھانجے ملک آمان خان سے ملاقات ہوئی اُن سے کہنے لگے کہ آج سے بہت عرصہ پہلے جب آپ کے والد حیات تھے تو اُن کے دس روپے میرے پاس رہ گئے تھے۔ مجھے پتہ ہے کہ تم وہ پیسے نہیں لو گے لیکن میں دینے کو تیار ہوں۔ میں اپنے ذمہ کوئی قرض باقی چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتا۔''

بیماری کے دوران ایک دن ہمارے مزارع محمود نے والد صاحب سے کہا کہ ہم نے ساری عمر آپ کا رزق کھایا ہے اگر ہم سے کوئی کمی بیشی ہوئی ہو تو ہمیں معاف کر دیں۔ والد صاحب نے اُن سے کہا کہ وہ نہ صرف انہیں بلکہ اپنے سارے مزارعوں اور اُن کی اولاد کو بھی معاف کرتے ہیں۔ انہوں نے محمود سے اپنے لئے بھی معافی کی درخواست کی۔

اُن دنوں وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ اُن سے حقوق اللہ کے سلسلے میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں اُن کی کمی کو کس طرح پورا کیا جائے اور وہ علما سے اور ہر اُس شخص سے جن کے علم پر اُنہیں اعتماد تھا اس بارے میں پوچھتے رہے اور اُن سے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے جیسے وہ دین کے قریب ہوتے گئے ویسے ہی اُن پر اپنی پرانی خامیاں اور عیاں ہوتی گئیں اور وہ ان کا کفارہ ادا کرنے کی فکر کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے دوست

مولانا شمس تبریز صاحب آف ساولڈھیر کو خصوصی طور پر بلایا اور اُن سے بھی رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مولانا صاحب نے اُنہیں تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت رحیم و کریم ہے۔ توبہ اور پشیمانی کا دروازہ آخری سانس تک کھلا رہتا ہے۔ اللہ کو ہمارے اچھے اعمال اتنے پسند نہیں جتنا اُن کو گناہوں پر پشیمانی اور توبہ پسند ہے۔ اس لئے آپ مطمئن رہیں۔ والد صاحب نے مولانا صاحب کو خصوصی طور پر یہ وصیت کی کہ انہوں نے والد صاحب کے جنازے میں تقریر کرنی ہے اور اُن کی طرف سے سارے لوگوں سے اُن کی دانستہ اور نادانستہ دونوں خطاؤں کی معافی مانگنی ہے۔

اپنی زندگی کا آخری مہینہ اُنہوں نے زیادہ تر ہسپتال میں گزارا۔ اس دوران اُن کے دوست حاجی بغداد شاہ، فقیر گل خان، رضوان اللہ عرف راجہ خان، صوبیدار ناہید شاہ اور ہمارے چچا زاد اور بہنوئی شاہد خان باری باری اُن کے ساتھ رہتے اور اُن کی خدمت کرتے رہتے۔ اسی دوران ہماری چھوٹی بہن جو سعودی عرب میں مقیم ہیں اُن کی بیماری کا سُن کر پاکستان آئی۔ والد صاحب اُن کے آنے سے بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اچھا ہوا کہ مرنے سے پہلے اُن کو دیکھ لوں۔ جب والد صاحب گھر پر ہوتے تو ہماری بڑی اور چھوٹی بہن اُن کی خدمت کرتی تھیں۔

اپنے آخری دنوں میں جب وہ ہسپتال میں داخل تھے تو ایک دن اُن کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ صدمہ میں چلے گئے۔ اُن کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ ہم پر نا اُمیدی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ فقیر گل خان نے گاؤں فون کیا کہ تدفین کے انتظامات شروع کئے جائیں۔ وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھے اور اُن کا بلڈ پریشر بہت گر چکا تھا۔ ڈاکٹر دوائیوں کے ذریعے اُن کا بلڈ پریشر بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش تھے۔ ایک وقت آیا کہ میں اُن کے ساتھ کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اس انتہائی تکلیف کی حالت میں جب میں نے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ نور سے چمک رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے اس بیماری اور

تکلیف نے اُن کی ساری لغزشیں اور گناہ دھو کر اُنہیں پاک صاف کر دیا ہے۔ میں نے فرطِ جذبات میں زندگی میں پہلی دفعہ اُن کے پاؤں دبانا شروع کیے اور اس بات پر افسوس کرنے لگا کہ میں ساری زندگی اپنے والد کی خدمت کرنے سے محروم رہا۔ اس میں یقیناً میری کوتاہی شامل تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ مجھ سے کسی قسم کی خدمت نہیں لینا چاہتے تھے۔ مجھ سے کیا وہ کسی سے بھی خدمت لینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے صرف دینا سیکھا تھا لینا نہیں سیکھا تھا۔ اگر وہ ہوش میں ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مختلف بہانوں سے مجھے اپنے پیر دبانے سے روکنے کی کوشش کرتے۔ اس سخت بیماری کی حالت میں جب اُن کی طبیعت ذرا سنبھل گئی اور وہ مکمل بے ہوشی سے نیم بے ہوشی کی حالت میں آ گئے تو میں نے اُنہیں آواز دی ''داجی! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' انہوں نے آنکھیں نیم وا کر کے میری طرف دیکھا اور اُسی نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک عجیب پرسکون اور خوابیدہ لہجے میں مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''خیر ہے، فکر نہ کرو، ایسا ہوتا رہتا ہے۔'' انہیں اس حالت میں بھی اپنی پرواہ نہیں تھی بلکہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ بعد میں وہ اس سخت بیماری سے وقتی طور پر صحت یاب ہوئے لیکن یہ صحت یابی عارضی ثابت ہوئی۔

ہم اُن کو ہسپتال سے ڈسچارج کرا کر بروز ہفتہ 23 دسمبر 2006ء کو گھر لے آئے کیونکہ اُن کی طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی۔ رات کو انہوں نے ہماری بیٹھک میں گزاری جہاں پر اُن کے دوست اُن کے ساتھ تھے۔ اتوار کی شام کو ان کے دوست اپنے گھروں کو چلے گئے اور شاہد خان اور ہمارے زمیندار نور محمد اُن کے ساتھ رہ گئے۔ رات کو تقریباً بارہ بجے اُن کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی تو ہم اُنہیں ایبزرگی ہسپتال لے گئے اور انہیں ڈرپ لگائی جس سے اُن کا بلڈ پریشر نارمل ہونا شروع ہو گیا اور اُن کی حالت تھوڑی سی سنبھل گئی۔ اس دوران وہ مکمل ہوش و حواس میں تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا وہ ہمارے ساتھ موجود میڈیکل سٹور کے مالک کو جانتے ہیں تو انہوں نے اُن کے والد کا نام لیا اور یہ بھی بتایا کہ اُن کی بہن بہت کم نمبروں

سے میڈیکل کالج جانے سے رہ گئی ہے۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے اور نور محمد والد صاحب کے پاؤں دبا رہے تھے کہ اُن کی طبیعت اچانک پھر خراب ہونا شروع ہوئی اور 24 اور 25 دسمبر 2006ء کی درمیانی شب کو تقریباً دو بجے خلوص، شرافت، خدمت اور انکساری کے پیکر یار قند خان اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

اگلے دن تین بجے سہ پہر اُن کی نماز جنازہ کا وقت مقرر ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق تمام اردگرد کے علاقوں کو لاوڈ سپیکر کے ذریعے اطلاع دے دی گئی جب انہیں غسل دیا گیا اور ان کو کفن پہنایا گیا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہے ہوں اور اُن کے چہرے پر سکون اور اطمینان چھایا تھا۔ اس دن صبح کے وقت بارش شروع ہوئی لیکن جنازے سے دو تین گھنٹے پہلے بارش بند ہوگئی اور دھوپ نکل آئی۔

جب اُن کے جسد خاکی کو جنازہ گاہ لے جایا گیا تو وہاں پر لوگوں کا ایک جمِ غفیر موجود تھا میں نے اپنی زندگی میں کاٹلنگ میں اتنا بڑا جنازہ نہیں دیکھا۔ ایسے لگتا تھا کہ پورے علاقہ سے لوگوں کا ایک سیلِ رواں اُمڈ آیا ہو۔ اُن کے آخری دیدار کے لئے آنے والے لوگوں کے جوش و جذبہ کو میں آج تک نہیں بھول سکا۔ ایسے لگتا تھا کہ علاقہ کے لوگ اور خصوصاً غریب عوام اپنے ہمدرد اور مونس وغم خوار کو شایاں نشان طریقے سے سفرِ آخرت پر رخصت کرنا چاہتے تھے۔

اُن کی وصیت کے مطابق اُن کا جنازہ مولانا عزیز الرحمٰن نے پڑھایا جو عرصۂ دراز تک ہمارے محلّہ کی مسجد کے پیش امام رہے۔ اُن کے والد مولانا عبدالجلیلؒ جو ایک انتہائی نیک اور صاحب کمال بزرگ تھے اور ہمارے آباواجداد اُن کے بہت قدردان تھے، بھی ساری عمر اس مسجد میں امامت کرتے رہے۔ اُن سے محبت اور خاندانی نسبت کی وجہ سے والد صاحب نے اپنی زندگی میں ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ اُن کا جنازہ عزیز اُستاد پڑھائیں گے۔ جنازہ کے بعد اُنہیں کاٹلنگ اڈہ میں اپنے بڑے بھائی حاجی زرقند خان کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اس موقع پر اُن کی وصیت کے مطابق مولانا شمس تبریز نے ایک مختصر مگر جامع تقریر کی اور کہا کہ اگر مرحوم کے ہاتھ یا زبان سے کسی کو نقصان پہنچا ہو

تو اُن کی درخواست ہے کہ اُنہیں صدقِ دل سے معاف کیا جائے۔

اُن کے دوست:

کہتے ہیں کہ انسان کے نام کے اس کی شخصیت پر کافی اثرات ہوتے ہیں۔ میں اوروں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن والدصاحب کے سلسلے میں تو یہ بات بالکل ٹھیک لگتی ہے۔ اُن کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا اور وہ اپنے دوستوں سے بہت محبت کرتے تھے اور اُن کی بہت قدر کرتے تھے۔ والدصاحب ایک واقعہ سناتے تھے کہ بچپن میں اُن کے بڑے بھائی ملک صنوبر خان مذاقاً اُن سے کہتے کہ تمہارے نام ''یار قند'' کا مطلب ہے میٹھی چیزوں کا دوست۔ اس پر والدصاحب رنجیدہ ہوئے اور انہیں اپنے نام سے نفرت ہونے لگی۔ ایک دفعہ سکول میں اُن کے کسی اُستاد نے انہیں بتایا کہ اُن کے نام کا صحیح مطلب ہے۔ ''میٹھا دوست یا بہترین دوست'' یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد اپنے نام پر فخر کرنے لگے۔

لگتا ہے کہ اُن کو دوست بنانے کا شوق سکول کے زمانے سے تھا اور یہ سلسلہ ساری عمر جاری رہا اُن کے حلقۂ احباب میں مختلف قسم کے لوگ شامل تھے۔ اُن میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، اُن سے عمر میں بڑے بھی تھے اور چھوٹے بھی، سنجیدہ مزاج والے بھی اور مزاحیہ طبیعت والے بھی۔ عملی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے اُن کے دوستوں کی تعداد اور بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ وہ اتنے مہمان نواز تھے اور دوستوں کی اتنی قدر کرتے تھے کہ اُن کا ہر دوست یہ سمجھتا تھا کہ والدصاحب اُنہیں دوسروں سے زیادہ عزت دیتے ہیں۔ میں بچپن سے اُن کے دوستوں کو دیکھتا رہا کیونکہ وہ ہمارے گھر آتے تھے۔ مجھے اُن کے اُس زمانے کے دوستوں میں سے غنی سرور، نادان خان، شمس الدین خان، سلیم خان، گل سید شاہ، فضل رحمان عرف ککے (جمال گڑھی)، بغداد علی خان، عبدالکریم خان (میاں خان) اور فقیر گل خان یاد ہیں۔ غنی سرور جنہیں ہم سرور کاکا کہتے تھے، مغلکو نوشہرہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن کراچی میں روزگار کے سلسلے میں مقیم

تھے اُن کا تعارف والد صاحب سے شمس الدین خان نے کرایا تھا۔ وہ جب بھی کراچی سے آتے تو کاٹلنگ ضرور آتے اور اپنے ساتھ ہمارے لئے کراچی کا حلوہ لاتے۔ والد صاحب جوانی میں ایک دفعہ کراچی گئے تھے جہاں پر سرور کاکا نے اُن کا بہت خیال رکھا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میں تقریباً سات آٹھ سال کا تھا جب سرور کاکا کشتی میں اپنے گاؤں مغللو جا رہے تھے اور اُن کی کشتی دریائے کابل میں ڈوب گئی تھی جس کی وجہ سے وہ جاں بحق ہو گئے تھے۔ اُن کی ناگہانی موت سے والد صاحب اور ہمیں بہت صدمہ پہنچا تھا۔

نادان خان بھی والد صاحب کے پرانے دوستوں میں شامل تھے وہ پشاور میں رہتے تھے جہاں پر اس وقت اُن کی ایک سرائے تھی۔ وہ اکثر کاٹلنگ آتے تھے اور پشاور سے ہمارے لئے مٹھائی لاتے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے کاٹلنگ میں شادی کی اور کچھ عرصہ یہاں پر مقیم رہے۔

سلیم خان، گل سید شاہ، فضل رحمان عرف ککے اور شمس الدین خان اکثر ہمارے گھر آتے تھے اور والد صاحب بھی جمال گڑھی جاتے رہتے تھے۔ اسی طرح بغداد علی خان اور عبدالکریم خان کا بھی آنا جانا رہتا تھا۔ بغداد علی خان کے سر کے بال سرخ رنگ کے تھے جس کی وجہ سے وہ منفرد نظر آتے تھے۔

والد صاحب کے بائیزو خرکی کے حاجی رحیم شاہ اور اُن کے بھانجے امیر دواللہ خان سے بھی بہت قریبی تعلقات تھے۔ اُن کے خاندان کے ساتھ ہمارے بزرگوں کے وقت سے تعلقات تھے۔ امیر دواللہ خان سعودی عرب میں تھے وہ جب بھی پاکستان آتے تو کاٹلنگ ضرور آتے اور ہمارے لئے وہاں سے مختلف تحفے لے کر آتے تھے۔

والد صاحب کے ارد گرد کے ہر گاؤں میں دوست موجود تھے۔ اس کے علاوہ ہر گاؤں میں اُن کے پارٹی والے اور سیاسی سپورٹر بھی موجود تھے۔ اُن میں سے اکثر کا انتقال ہو چکا ہے لیکن کچھ ابھی بھی بقید حیات ہیں ان میں سے بہت سوں کے نام مجھے یاد نہیں۔ ان میں

سے کچھ نام جو مجھے یاد ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

میرداد خان چیئرمین صاحب، عبدالستار خان، امیر محمد خان سیکرٹری یونین کونسل، قیمت گل خان، دلاورشاہ خان، ظہور خان سابقہ چیئرمین یونین کونسل اور مولانا شمس تبریز، امین خان۔ (ساولڈھیر)

محمد دین خان، محمد اکرام خان، محمد اقبال خان، محمد شیر خان اور صنوبر خان عرف جرنیل۔ (جمال گڑھی)

حاجی عبدالخالق خان، حاجی جندول خان، فضل غنی ٹھیکیدار اور باغی شاہ۔ (متہ)

محمد گل خان (شموزئی)، ملک مہر دل خان، کچکول خان (کٹی گڑھی)

گل غفور خان اور گل فراز خان (بابوزئی)، محمد رحمان خان (اَلو)، سردار علی خان (قاسمی)

سکندر خان ریٹائرڈ ایس ایس پی، یار دل خان (سنگاہو)، نور کمال خان، رسول شاہ (میاں خان)۔

بنارس خان ایڈوکیٹ، حاجی وارث خان، عبداللہ ملک (کوہی برمول)

خان گل ماما، شاہ عالم خان ایڈوکیٹ، سردار حسین (مردان)

اپنے خاندان میں والد صاحب سب کی عزت کرتے تھے اُن کے رشتہ دار بھی اُن کی عزت کرتے تھے اور سیاست میں اُن کا ساتھ دیتے تھے لیکن خاندان میں اُن کی دوستی حاجی صاحب خیر محمد خان کے ساتھ زیادہ تھی۔ بعد میں تاج محمد خان کاکا سے بھی اُن کی دوستی ہوگئی تھی۔ اس میں طبیعتوں کا بھی بڑا دخل ہے کیونکہ بعض لوگ قدرتی طور پر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اُن کے اپنے بہنوئی مومن خان آف شاہ ڈھنڈ سے بھی قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔

والد صاحب کو مشال خان آف شیرو سے بہت محبت تھی اور اُن کی بہت قدر کرتے تھے اسی طرح مشال خان بھی اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ مشال خان کے بڑے بیٹے سلیم

خان کو بھی والد صاحب بہت پسند کرتے تھے۔ وہ گل غفور خان آف بابوزئی کو بھی بہت پسند کرتے تھے اور اکثر اُن کی تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ نوابزادہ محمد علی خان ہوتی کی بہت عزت کرتے تھے اور اُن کی شرافت کے معترف تھے۔ اُن کے دوستوں میں سے یقیناً بہت سے نام مجھ سے رہ گئے ہوں گے جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

ان دوستوں کے علاوہ اُن کے قریبی دوستوں کا ایک اور حلقہ تھا جس کو اگر مغل بادشاہ اکبر کے نورتن سے تشبیہہ دی جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ وہ دوست تھے جن سے اُن کی بے تکلفی تھی اور اُن سے کچھ نہیں چھپاتے تھے۔ وہ تقریباً ہر روز ملتے تھے اور کاٹلنگ اڈہ میں واقع ہمارے بالاخانہ میں بیٹھ کر گپ شپ لگاتے تھے ان میں زیادہ تر کا تعلق بابوزئی کاٹلنگ سے تھا۔ ان میں مختلف مزاج اور پس منظر کے دوست موجود تھے۔ وہ اپنی گپ شپ کے لئے دلچسپ موضوعات ڈھونڈتے تھے اور اگر ایسے موضوعات کی کمی ہوتی تو وہ اپنی طرف سے ایجاد کرتے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور تقریباً ساری عمر ساتھ رہے۔ وہ اکثر ایک دوسرے کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے تھے لیکن ہر کوئی اس کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ اُن میں سے اگر کوئی دوست ناراض ہو جاتا تو باقی اُس کو جلدی منا لیتے تھے۔

والد صاحب کے ان دوستوں میں فقیر گل خان، ملک سبز علی خان مرحوم، گل فراز خان، دلبر خان، ڈاکٹر محمد اجمل خان، ریداد گل بابو، بخت بلند خان، نور غلام خان، صوبیدار ناہید شاہ، عارف اللہ اُستاد، عثمان غنی، صوبیدار نور غنی، گل شیراز خان مرحوم، گل محمد خان، شاہ حسین خان، یار محمد خان مرحوم، صوبیدار فضل حسین، نثار خان، شاکر مرزا صاحب، شمیم خان، پیرداد مرزا، گل داد شاہ وغیرہ شامل تھے۔ وہ دو تین مہینے میں کوئی دعوت کرتے یا کسی جگہ سیر کے لئے جانے کا انتظام کرتے جس میں وہ اپنے چند دوسرے دوستوں مثلاً سعید خان آف لوندخوڑ، اکرم خان ماما، عبدالکبیر خان اور فیض اللہ خان وغیرہ کو بھی مدعو کرتے۔

ویسے تو ان کے یہ سارے دوست اپنی ذات میں ایک انجمن تھے لیکن ملک سبز علی

خان ، دلبر خان اور ڈاکٹر اجمل کی تو بات ہی اور تھی ۔ اُن کی وجہ سے محفل میں ہر وقت رونق رہتی تھی ۔ ملک سبز علی خان ایک بھاری بھرکم اور بارعب شخصیت کے مالک تھے ۔ وہ بہت جلد ناراض ہو جاتے تھے لیکن مان بھی جلدی جاتے تھے ۔ اُن کے دوست انہیں مختلف طریقوں سے چھیڑنے کی کوشش کرتے تھے جس سے وہ غصے میں آ جاتے اور سب کو اونچی آواز سے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے ۔ اُن کو چھیڑنے والوں میں فقیر گل خان ، راجہ خان اور بخت بلند خان سرفہرست تھے ۔ چونکہ انہیں پتہ تھا کہ ملک صاحب کا غصہ وقتی ہوتا ہے اور وہ کوئی بات دل میں نہیں رکھتے اس لئے کچھ دیر بعد وہ اُن کو مختلف حیلوں بہانوں سے راضی کر لیتے تھے ۔ ملک صاحب کو کھانے کا بہت شوق تھا لیکن وہ کھانا کم کھاتے تھے ۔ ساتھی شرارتاً اُن سے کہتے کہ کھانا شروع ہونے سے پہلے گل خان یا کسی دوسرے نے فلاں چیز کھالی ہے تو ملک صاحب غصہ میں آ کر اُن پر چڑھ دوڑتے اور کہتے کہ انہوں نے تو سارا کھانا ختم کرلیا ہے ۔لیکن جب کھانا کھانے کا وقت آ تا تو ملک صاحب تھوڑا کھانے کے بعد ہاتھ روک لیتے ۔

ملک صاحب کو لوگوں کی سفارش کرنے اور کام کرنے کا بہت شوق تھا اور اُن کے افسرانِ بالا سے تعلقات بھی تھے ۔ اگر کوئی ملک صاحب سے کہتا کہ فلاں افسر کو کسی کام کے سلسلے میں سفارش کرنی ہے تو وہ فوراً راضی ہو جاتے اور پھر صبح سویرے سائل کے گھر پہنچ کر اُن کو ساتھ لیکر افسر کے دفتر پہنچ جاتے ۔ اگر کبھی کبھار سائل کسی وجہ سے جانے سے معذوری کا اظہار کرتا تو ملک صاحب غصہ میں آ جاتے اور اپنی مخصوص اونچی آواز میں گلہ کرتے کہ وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر آ گئے ہیں اور وہ بہانے بنا رہے ہیں وہ سائل کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک اُن کو ساتھ لیکر سفارش کی جگہ نہ لے جاتے ۔ آپ کو والد صاحب کی تحریروں میں ملک صاحب کی شخصیت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دے گی ۔

دلبر خان کی اپنی ایک شان تھی ۔ وہ رکھ رکھاؤ کے قائل تھے اور ہر کسی کے ساتھ بے تکلف ہونے کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ وہ ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ چلتے تھے اور اُن کے

رویے سے ایسے ظاہر ہوتا جیسے اُنہیں کسی چیز کی پرواہ ہی نہیں۔ مثلاً اگر آپ انہیں خبر سناتے کہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہوگیا ہے تو وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتے ''ٹھیک ہے۔ مارشل لاء تو لگتے رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس پر بحث کروں۔'' دلبر خان کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی سے متاثر نہیں ہوتے تھے اور اگر کوئی بہت بڑا کارنامہ بھی سرانجام دیتا تھا تو وہ اس کو اپنے مخصوص ''ٹھیک ہے'' والے فقرے میں نظرانداز کر دیتے تھے۔ وہ خصوصاً ملک صاحب سے بالکل متاثر نہیں تھے اور دونوں کے درمیان مسابقت اور نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ باقی دوست اس مسابقت کو جان بوجھ کر ہوا دینے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کی نوک جھونک سے محفل میں رونق پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ جب ایک دوسرے کے ساتھ اکیلے ہوتے تو شیر وشکر ہوتے لیکن اور دوستوں کی موجودگی میں حریفانہ رویہ اختیار کر لیتے تھے۔ دلبر خان اپنی تعریف سے خوش ہوتے تھے اور اپنی بہادری اور دلیری کے واقعات مزے لے لے کر سناتے تھے۔ اُن کے بہت سے واقعات کا تعلق ایران سے تھا جہاں وہ کسی زمانے میں مزدوری کے لئے گئے تھے۔

جب والد صاحب 2004ء میں حج کے لئے جا رہے تھے تو اُن دنوں دلبر خان بیمار ہو گئے تھے اور اُن کے سعودی عرب میں قیام کے دوران دلبر خان کی موت واقع ہوئی۔ والد صاحب کو اُن کی وفات کا پتہ واپس آنے پر چلا۔ وہ دلبر خان کی موت پر بہت رنجیدہ ہوئے اور کہا کہ حج کے دوران وہ اُن کی صحت یابی کے لئے دعا کرتے رہے۔

ڈاکٹر اجمل خان بھی ایک دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں گپ شپ کا بہت شوق تھا اور اس کے لئے وہ اپنے ضروری کام بھی چھوڑنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ علاقہ کاٹلنگ کے اولین ڈاکٹروں میں سے تھے اور اگر چاہتے تو لاکھوں روپے آسانی سے کما سکتے تھے لیکن انہیں پیسے کمانے سے دلچسپی نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک اچھے شاعر تھے اور اپنے کالج کے دنوں میں انقلابی شعر کہتے تھے۔ وہ بعض اوقات اپنے دوستوں پر مزاحیہ اشعار بھی لکھتے تھے۔ ڈاکٹر

صاحب کو دوستانہ اور معصومانہ شرارتوں کا شوق تھا جسے بعد میں وہ مبالغہ آرائی کے ساتھ دوسرے دوستوں کو سناتے تھے۔ والد صاحب کی تحریروں میں آپ کو ڈاکٹر صاحب کے کئی دلچسپ واقعات ملیں گے۔

اُن کے دوستوں میں فقیر گل خان والد صاحب کے سب سے قریب رہے۔ وہ 1969ء سے اُن کی وفات (دسمبر 2006ء) تک مسلسل اُن کے ساتھ رہے۔ وہ فقیر گل خان پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کی تحریروں میں فقیر گل خان ہر جگہ موجود نظر آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے اور اُن کے سارے دوست بھی اس کی گواہی دیں گے کہ وہ اپنے تمام دوستوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کی زندگی کے آخری سالوں میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُن کے کچھ دوست اُن کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے اس واقعہ کی زیادہ تفصیلات معلوم نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے اُن کی طبیعت نسبتاً زیادہ حساس ہوگئی تھی۔ اپنے دیرینہ دوستوں کے جانے کا انہیں بہت دکھ تھا۔ ایک ایسا شخص جس کی ساری زندگی دوست بنانے اور دوستی نبھانے میں گزری ہو اور اس کے دیرینہ دوست اس بڑھاپے میں اُن کو چھوڑ جائیں یقیناً ایک تکلیف دہ امر تھا۔ بعد میں اُن کے سارے دوست ایک ایک کر کے دوبارہ اُن کی محفل میں واپس آ گئے جس سے وہ بہت خوش ہوئے اور اُنہیں گرم جوشی سے قبول کیا۔ انہوں نے شاہ حسین سے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے دوست میرا سرمایہ ہیں اور میں انہیں کھونا نہیں چاہتا۔

اُن کی تحریریں:

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ والد صاحب ایک اچھے لکھاری بھی تھے۔ اُن کے ہاتھ کی لکھائی بہت خوبصورت تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے متعلق مزاحیہ خاکے لکھتے تھے اور اپنے تفریحی

دوروں کے احوال بھی قلم بند کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ سنجیدہ موضوعات پر بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اُن کی کئی تحریریں ضائع ہوگئی ہیں۔ جو تحریریں میرے پاس موجود تھیں میں نے اُنہیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح اس کتاب کا نقشہ ذہن میں آیا۔

میں یہاں ایک بار پھر یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تحریریں یا خاکے اُنہوں نے اپنے ذوق کی تسکین اور اپنے دوستوں کو محظوظ کرنے کے لئے لکھے تھے۔ لکھنے کے بعد وہ یہ تحریریں اپنے دوستوں کے سامنے پڑھتے اور وہ سب اس سے لطف اُٹھاتے۔ جن دوستوں کے متعلق یہ خاکے لکھے گئے انہوں نے اسے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ والد صاحب کا اِن خاکوں کو شائع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

والد صاحب کی تحریریں اُن کے ادبی ذوق اور مطالعہ کی آئینہ دار ہیں۔ ان تحریروں میں آپ کو والد صاحب اور اُن کے دوست جیتے جاگتے کرداروں کی صورت میں نظر آئیں گے اور آپ اُن کے مزاحیہ واقعات سے لطف اُٹھائیں گے۔ اگر آپ ان کرداروں کو جانتے ہیں یا انہیں دیکھا ہوا ہے تو اس سے آپ کے پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ میں یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان تحریروں میں صرف اُن دوستوں کا ذکر ہے جن سے والد صاحب کی آزادانہ گپ شپ تھی اور جو ایک خاص گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے بہت سے قریبی دوست ایسے ہیں جن کا ان تحریروں میں ذکر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ساتھ والد صاحب کے سنجیدہ تعلقات تھے جو باہمی احترام پر مبنی تھے اور جن میں طنز و مزاح کی گنجائش کم تھی۔

اس کتاب کا بنیادی مقصد یارقند خان کی خدمات کو یاد کرنا، اُن کو خراجِ تحسین پیش کرنا اور اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے۔ اُن کی شخصیت اُن کے دوستوں کے بغیر نامکمل تھی اس لئے یہ کتاب ان کے ساتھ ساتھ اُن کے دوستوں کے ذکر سے بھی معمور ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں یارقند خان کا ایک تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اُن کے دوستوں، رشتہ داروں اور دوسرے جاننے والوں کی اُن کے متعلق تاثرات کو

یکجا کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں اُن کی تحریریں جمع کی گئی ہیں جن میں سے زیادہ تر مزاحیہ نوعیت کی ہیں اور اُن کے قریبی دوستوں کے متعلق ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب یارقند خان مرحوم کے بارے میں مفید معلومات کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی سے کچھ سیکھنے کا موقع بھی فراہم کرے گی۔

اس کتاب کی تیاری میں تعاوُن پر میں والد صاحب کے دوستوں اور اپنے دوستوں کا بے حد ممنون ہوں۔ اُن کے علاوہ میں شعبۂ اُردو جامعہ پشاور کے ڈاکٹر سہیل صاحب اور اُن کے ہونہار شاگرد حسین گل سائل کا بہت شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری کے مختلف مراحل میں میری بہت مدد کی۔

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے والد مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اُنہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ڈاکٹر شبیر احمد خان

فرزند یارقند خان

......☆......

دیرینہ رفاقت

یہ غالباً 1969ء کا واقعہ ہے جب میں تعلیم سے فراغت کے بعد گاؤں میں مقیم تھا۔ حسب عادت میں حجرہ میں موجود لوگوں کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا کہ اسی دوران قاضی صاحب غلام حیدر آئے۔معلوم ہوا کہ قاضی صاحب ایک تحریک چلانے کے لئے سرگرم تھے اور عوامی رابطہ مہم شروع کر رکھی تھی کہ مردان سے کاٹلنگ تک ٹرانسپورٹ والے لوگوں سے من مانی کرایہ وصول کرتے ہیں۔ جس کے خلاف ہم سب کو متحد ہو کر کوشش کرنی چاہیے۔ میں قاضی صاحب کی باتوں سے متاثر ہوا اور دل میں فیصلہ کیا کہ اس تحریک میں ان کا ساتھ دوں گا۔ بعد میں ہم گاؤں کے سرکردہ لوگوں سے ملنے کے لئے قاضی صاحب کی معیت میں روانہ ہوئے۔ مختلف لوگوں سے ملاقات کے بعد ہم یار قند خان چیئرمین صاحب سے ملے۔ یہ اُن سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اسی تحریک نے ایک تنظیم کو جنم دیا جس کے سرپرست اعلیٰ یار قند خان منتخب ہوئے۔ اس تنظیم میں مجھے سیکرٹری کی ذمہ داری سونپی گئی یہ تحریک اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب رہی اور اس تحریک کی بدولت کاٹلنگ کے لئے جی ٹی ایس سروس شروع کرائی گئی۔اسی تحریک کی وجہ سے میں یار قند خان کے قریب ہوتا چلا گیا اور پھر یہ تعلق جو کہ کئی دہائیوں پر مشتمل تھا الحمد للہ ساری زندگی اُسی طرح قائم ودائم رہا۔

یار قند خان نے اپنی محنت اور کوشش سے اس تنظیم کو پورے علاقہ میں وسعت دی۔ یہ ہمارے علاقہ کی پہلی سماجی اور فلاحی تنظیم تصور کی جاتی ہے اور اس نے مختلف مواقع پر اپنی کارکردگی سے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔ یار قند خان علاقہ کی مقبول ترین شخصیت تصور کئے

جاتے تھے۔ پورے علاقے کے ہر گاؤں میں اُن کے دوست موجود تھے۔ اُن کے اسی مقبولیت کی وجہ سے جب حکومتی سطح پر ایک اصلاحی کمیٹی کی ضرورت محسوس کی گئی اور پورے علاقہ کے لئے سرکاری تعاوُن سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تو یارقند خان کو اس کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا۔ علاقہ کے معزز لوگوں پر مشتمل یہ کمیٹی لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتی تھی۔ میرے پاس کوئی باضابطہ عہدہ نہیں تھا لیکن یارقند خان کے ساتھی کی حیثیت سے میں تقریباً ہر معاملہ میں اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ اس دوران ہم نے علاقہ کے تقریباً ہر گاؤں کا دورہ کیا۔ بڑی بڑی دشمنیاں اسی کمیٹی کی بدولت دوستیوں میں بدل گئیں۔ کمیٹی نے دوسرے تنازعات کے حل کے سلسلے میں بھی بہت کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ کمیٹی اتنی با اثر تھی کہ علاقہ کے لوگ با قاعدہ درخواست لکھ کر اس کو اپنے مسائل کی طرف متوجہ کراتے۔

1970ء میں یارقند خان اپنے سسر مرحوم غلام محمد خان آف لوندخوڑ کے انتخابات میں عملی طور پر سرگرم رہے۔ انہوں نے سیاست کا آغاز مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کیا اور تین مرتبہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ میں سیاسی سرگرمیوں میں ہمیشہ اُن کے شانہ بشانہ رہا اور اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اُن ہی کے ساتھ گزارا۔ مختلف اوقات میں مختلف لوگ چیئر مین صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل ہوتے رہے۔ وہ ایک وسیع حلقہ احباب رکھتے تھے اور سب دوستوں کو ساتھ لے کر چلنے میں مہارت رکھتے تھے۔ زندگی میں کبھی کبھار سخت اور کٹھن لمحات بھی آتے رہتے ہیں مگر میں نے چیئر مین صاحب کو ہر حال میں باحوصلہ پایا۔ کبھی اُن کو غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ حسد اور لالچ سے اُن کی زندگی مبرا تھی۔

یارقند خان دوستوں کے علاوہ مخالفین کو بھی اپنا گرویدہ بنانے میں ثانی نہیں رکھتے تھے وہ اپنے مخالفین کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔ انتقامی کاروائی پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ حسن اخلاق اور اعلیٰ کردار سے مخالفین کو رام کرتے تھے۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ اُن کا ساولڈھیر کے ایک رہائشی زمیندار قاسم خان سے زمین کا تنازعہ تھا اور دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف عدالت

میں مقدمات دائر کئے تھے۔ ایک دن سول عدالت مردان میں اُن کی تاریخ تھی اور اُن کی طبیعت ناساز تھی اس لئے انہوں نے مجھے کہا کہ میں اُن کی جگہ عدالت چلا جاؤں۔ میں نے اُن کے حکم کی تعمیل کی اور عدالت چلا گیا۔ عدالت نے جیسے حاضری کے لئے آواز دی میں اندر چلا گیا اور جج صاحب کو بتایا کہ یارقند خان چونکہ بیمار ہے اس لئے وہ نہیں آ سکتے۔ اُن کا مخالف قاسم خان بھی موجود تھا جب ہم عدالت سے باہر نکلے تو قاسم خان میرے پاس آیا اور انتہائی افسردگی کے عالم میں مجھ سے دریافت کیا کہ کیا یارقند خان زیادہ بیمار ہیں؟ میں نے کہا کوئی خاص بات نہیں بس طبیعت معمولی خراب تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ قاسم خان فکرمند تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ قاسم خان مردان سے سیدھا چیئرمین صاحب کی عیادت کے لئے اُن کے گھر پہنچے۔ بیمار پرسی کے بعد چیئرمین صاحب نے اُسے کہا کہ تمہیں میری ایک شرط ماننی پڑے گی اور وہ یہ کہ میں خود سے تمہیں جج مقرر کرتا ہوں تم اسی وقت فیصلہ کرو۔ قاسم خان نے کہا کہ نہیں چیئرمین صاحب آپ بڑے ہیں اور آپ کا فیصلہ میرے لئے قابل قبول ہے۔ چیئرمین صاحب نے اُسے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو سیدھا شکرتنگی جاؤ اور میرے زمیندار کو کہو کہ مجھے چیئرمین صاحب نے بھیجا ہے اور تم جیسے مناسب سمجھو اُسی طرح ہی فیصلہ کرو۔ اس طرح وہ تنازعہ بخیر وخوبی حل ہوگیا۔

اسی طرح کے کئی واقعات میرے ذہن میں ہیں جس میں چیئرمین صاحب نے خود سے زیادہ دوسروں کو اہمیت اور عزت دی۔ عام لوگوں سے اُن کی ہمدردی اور امداد کے ان گنت واقعات موجود ہیں۔ چیئرمین صاحب پیسے جمع کرنے کے حق میں نہیں تھے اور جو کچھ بھی کمائی ہوتی تھی زیادہ حصہ دوستوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کیا کرتے تھے۔ اسی بات کا بین ثبوت یہ ہے کہ کبھی انہوں نے بینک میں اپنا اکاؤنٹ نہیں کھلوایا۔

وہ دوستوں کی محفل میں انتہائی سکون محسوس کرتے تھے اور اگر کوئی دوست غیر حاضر ہو جاتا تو اس کا پتہ کرواتے تھے وہ خود جاتے یا کسی کو اس کا حال پوچھنے بھیج دیا کرتے تھے۔ میں نے زندگی میں چیئرمین صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ شرافت اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا اور

غیرمہذب اور بدکردار لوگوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور بلا خوف وخطر اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔

چیئرمین صاحب دوستوں کے درمیان نوک جھونک سے بہت محظوظ ہوتے تھے اور اُن کی کوشش ہوتی تھی کہ ایک دوست کا توڑ دوسرے دوست کی شکل میں موجود ہو۔ وہ اس کام میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہماری محفل میں مختلف مزاج اور طبیعت کے دوست موجود تھے جن کی وجہ سے ہر وقت رونق رہتی تھی۔ ہمارے دوستوں میں بہت دلچسپ شخصیات موجود تھیں۔ ان میں ڈاکٹر اجمل، ملک سبزعلی، دلبر خان، رضوان اللہ راجا، گل محمد خان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سنجیدہ دوست بھی بہت تھے اور محفل کی رنگینیوں میں ہر ایک اپنا حصہ ڈالتا تھا۔ چیئرمین صاحب کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو ہم کبھی پُر نہیں کر سکتے اور ہمیں ہر موقع پر اُن کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

فقیر گل خان

۱۷۔۰۱۔۲۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

حاجی یارقند خان (مرحوم) کے ساتھ چند ملاقاتیں

حاجی یارقند خان مرحوم کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ ایک سماجی اور سیاسی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی سخی، بامروت اور اپنے دوستوں کے لئے انتہائی متواضع اور چاہنے والے انسان تھے۔ راقم الحروف بندۂ ناچیز دارالعلوم اکوڑہ خٹک سے فاضل پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کے علاوہ جامع مسجد ساولڈھیر (المعروف جامع مسجد زین خان بابا) کے امام وخطیب ہیں ۔ مجھ سے مرحوم خصوصی انسیت رکھتے تھے۔ محترم یارقند خان صاحب ایک دفعہ سیاسی مہم کے دوران ساولڈھیر تشریف لائے تھے۔ بندہ نے اُن کا تعارف مختصر انداز میں کیا جس پرعوام انتہائی خوش ہوئے اور آپ کے الیکشن میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کی انتخابی مہم کے روح رواں حاجی میرداد خان صاحب سابقہ چیئرمین یونین کونسل ساولڈھیر اور سماجی کارکن اور مسلم لیگی رہنما جناب قیمت گل خان تھے۔ ساولڈھیر میں آپ کو انتہائی پذیرائی حاصل ہوئی اور آپ تمام پولنگ اسٹیشنوں پر زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئے جس کی وجہ سے آپ ساری زندگی وہاں کے لوگوں کے مشکور رہے۔ ساولڈھیر کے ساتھ اُن کی محبت بندۂ ناچیز اور مذکورہ دوحضرات کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ۔

آپ نے اپنے بیٹے ڈاکٹر شبیر احمد صاحب کی منگنی میں ہم سب کو بلا کر عزت بخشی ۔ اس کے علاوہ گاہے بہ گاہے اُن کے ساتھ ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ جب ہم شادی یا غمی کے سلسلے میں کاٹلنگ جاتے تو اُن سے ضرور ملاقات کرتے ۔ یارقند خان چونکہ دریا دل انسان تھے اس لئے مہمانوں کی بہت عزت اور تواضع کرتے تھے۔ مہمانوں کے لئے جو کچھ منگواتے ان کا بڑا

حصہ بندۂ ناچیز کو گھر لے جانے پر اصرار کرتے۔

2004ء میں بندۂ ناچیز نے حج بیت اللہ کا داخلہ کیا حاجی یار قند خان صاحب نے جب سنا تو بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بھی حج بیت اللہ کے لئے داخلہ کیا۔ جنوری 2004ء میں ہم دونوں کی حج بیت اللہ کی منظوری ہوئی۔ حاجی یار قند خان صاحب نے بندہ کو مبلغ پانچ ہزار روپیہ ہدیتاً دے دیئے کہ اس رقم کو مدینہ منورہ میں خرچ کریں۔ میں نے رقم قبول کی مگر ساتھ کہا کہ سفر انتہائی نازک ہے اگر یہ رقم مدینہ منورہ میں خرچ نہ ہوسکی تو پھر؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جہاں ہوسکے خرچ کریں۔ مگر دیارِ رسول اللہ ﷺ کا نام مبارک بار بار زبان پر آتا رہا۔ جو ان کے حب رسول ﷺ کا آئینہ دار تھا۔

حج بیت اللہ کے بعد حاجی یار قند خان صاحب نے موضع کاٹلنگ میں بندہ کو مدعو کیا۔ بندۂ ناچیز نے بھی آپ کو دعوت دی مگر آپ نے قبول نہیں کی۔ بلکہ مذاقاً کہا کہ مولوی لوگوں کو کھلانا ثواب ہے مولوی لوگوں سے کھانا ثواب نہیں ہے۔ وہ بندۂ ناچیز راقم الحروف مولانا شمس تبریز آف ساولڈھیر کے ساتھ بہت زیادہ محبت فرماتے اور مرض وفات میں بھی مجھے بلایا اور وصیت فرمائی کہ موت حق ہے آنا ہی ہے مگر میرے وفات کے بعد میرے قبر پر وعظ آپ ہی کریں گے۔ بندہ نے یار قند خان صاحب کی وصیت پر جوں کا توں عمل کیا۔

جب بھی کاٹلنگ جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو بندہ یار قند خان صاحب کے قبر مبارک پر سلام کے لئے ضرور حاضر ہوتا ہے۔ ارد گرد دکاندار دیکھ کر تواضع کرنے کے لئے اصرار کرتے ہیں مگر بندہ صرف آپ کے قبر مبارک کے سلام پر اکتفا کرتا ہے اور آپ کی وجہ سے آپ کے پورے خاندان کا خیال رکھتا ہے اور اسی طرح رکھتا رہے گا۔ آخری بات بندہ نے ایک دفعہ اُن کے اسم مبارک کا ترجمہ وعظ کے دوران کیا کہ یار قند خان کے معنی ہیں دوستوں کے لئے قند یعنی میٹھا۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور زبردست محبت کا مظاہرہ فرمایا۔ ڈاکٹر شبیر احمد صاحب جو کہ آپ کے فرزند ارجمند ہیں کو فراغت نہیں۔ خدمت خلق کرتے ہیں صحت کے حوالے سے۔

اس لئے تعلقات کچھ کمزور پڑ گئے ہیں۔ تاہم بندہ راقم الحروف تا دم مرگ حاجی یارقند خان صاحب کی محبت کو یاد رکھے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ حاجی یارقند خان صاحب جو حاتم طائی جیسے سخی اور بامروت تھے کو حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنے قرب و جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔آمین۔

راقم الحروف
مولانا شمس تبریز
ساکن خطیب جامع مسجد ساولڈھیر

مردِ خود آگاہ

یہ سال 1970ء کے گرمیوں کے دن تھے راقم الحروف آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ابھی کچھ عرصہ پہلے والد محترم کا انتقال ہو گیا تھا۔مغرب کے وقت گھر پہنچا تو ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا ملا جس پر لکھا کہ ''کل صبح کاٹلنگ پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او صاحب کے روبرو پیش ہو جاؤ'' بارہ، تیرہ سال کی عمر میں پولیس اسٹیشن کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔اس سے پہلے کبھی ایس ایچ او صاحب نام کے کسی شخصیت سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔اپنی بائی سائیکل پر سوار ہو کر چھ میل دور کاٹلنگ پہنچا اور کسی طرح پولیس اسٹیشن پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔دروازے پر ایستادہ سنتری صاحب کو کاغذ دکھایا انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اندر ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا کہ جاؤ محرر صاحب سے ملو۔میں اُچھلتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ محرر صاحب کے روبرو پیش ہوا وہ کام میں مصروف تھے چند لمحوں بعد میری طرف نظریں اُٹھا کر دیکھا میں نے تھانے کی طرف سے بھیجا ہوا کاغذ اُن کے سامنے میز پر رکھا کاغذ دیکھ کر انہوں نے میرا نام پوچھا جونہی میں نے نام بتایا محرر صاحب پھٹ پڑے اور شدید غصے کی حالت میں مجھے کہا تم تو بڑے بدمعاش ہو میں ہر ہفتے تمہیں حاضر ہونے کے لئے اطلاع بھیجتا ہوں اور تم ہو کہ حاضر ہی نہیں ہوتے ساتھ ہی بلند آواز سے سنتری کو بلایا کہ وہ مجھے حوالات میں بند کرے۔سنتری مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک غار نما کمرے کے سامنے لے گیا اسی دوران ایک شخص درمیانہ قد، گندمی رنگت، تھوڑا سا آگے کو جھکا ہوا دونوں ہاتھ سلام کے انداز میں ماتھے پر رکھے تھانے میں داخل ہو گیا سنتری کے ساتھ سلام دُعا کی۔نو وارد شخص نے مجھ پر بھی ایک نظر ڈالی اور اندر چلا گیا۔سنتری مجھے حوالات میں بند کرنے سے پہلے میری تلاشی لے رہا تھا کہ اس دوران محرر صاحب کی آواز ایک بار پھر گونجی اور سنتری کو حکم دیا کہ وہ مجھے حوالات میں بند کرنے کے بجائے واپس اُس کے کمرے میں لے

آئے۔ جب ہم محرر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو نو وارد شخص اُن کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا میری طرف دیکھ کر پوچھا کہاں کے ہو؟ میں نے کہا کہ میں ساولڈھیر کا ہوں اُس نے مجھے چائے پانی کا پوچھا میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کیا تو انہوں نے کہا کہ پولیس کی طرف سے تم آزاد ہو اور اپنے گھر جا سکتے ہو۔ تھانے سے نکلا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ شخصیت یارقند خان (سابقہ چیئر مین یونین کونسل کاٹلنگ) ہیں۔ نیز یہ بات بھی ذہن میں بیٹھ گئی کہ چیئر مین کوئی بڑی شخصیت ہوتی ہے جو یوں آسانی سے کسی کو پولیس کے چنگل سے چھڑا سکتا ہے۔ کاٹلنگ تپہ شرقی بائیزئی کا مرکزی مقام اور بڑا قصبہ ہے جس میں ایک مشہور اور معزز خاندان رہتا ہے جس کو محمودی پشتو میں تلفظ (ماموتی) کہا جاتا ہے۔ یہ خاندان علاقے کے دوسرے اکثر دیہات میں بھی موجود ہے، یارقند خان اس خاندان کے چشم و چراغ اور سربراہ تھے۔ عرصہ 9 سال بعد (1979) میں منعقدہ بلدیاتی انتخابات میں راقم الحروف خود اپنے یونین کونسل ساولڈھیر کا چیئر مین منتخب ہو گیا۔ چونکہ کاٹلنگ تپہ شرقی بائیزئی کا صدر مقام تھا جہاں تھانہ واقع تھا اور ریذیڈنٹ مجسٹریٹ بھی بیٹھا کرتا تھا، اور مصروف تجارتی قصبے کی حیثیت رکھتا تھا (اب کاٹلنگ تو باقاعدہ ایک تحصیل بن چکا ہے) لیکن اس وقت بھی اس کی اہمیت کچھ کم نہیں تھی۔ یارقند خان اس علاقے کے ایک مشہور، مؤثر اور متحرک سیاسی شخصیت تھے۔ مجھے بھی بحیثیت چیئر مین اور کئی دوسرے معاملات کے سلسلے میں ہفتے میں کئی بار کاٹلنگ جانا پڑتا تھا۔ اور اکثر تھانہ کچہری اور شادی غمی کے موقعوں پر یارقند خان کے ساتھ ملاقات ایک معمول بن گیا تھا۔ پہلے شناسائی تھی پھر دوستی اور دوستی گہری قربت اور باہمی احترام میں تبدیلی ہوتی چلی گئی، راقم الحروف اور یارقند خان چیئر مین کے عمروں میں تفاوت بیس، پچیس سال سے ہرگز کم نہ تھی۔ لیکن اُن کے ملنے کے انداز اور محبت نے کبھی عمر کے اس تفاوت کو باہمی احترام میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ یارقند خان بہت سی خوبیوں کے مالک تھے لیکن تین ایسی خوبیاں اور محاسن جن کا میں گرویدہ تھا اور اُن کی شخصیت کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھی درجہ ذیل ہیں:

ا) اللہ تعالیٰ نے یارقند خان کو خاندانی وجاہت کے علاوہ مال و دولت کی فراوانی سے بھی نوازا تھا۔ لیکن اللہ کا یہ بندہ تکبر اور انا پرستی سے کوسوں دور تھا۔ خاکسار اور منکسر المزاج تھا۔ عام اور سادہ لباس

استعمال کرتا تھا،تقریبات اور دوسرے مواقعے پر عام لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور کبھی اپنے لئے خصوصی نشست اور مقام کی خواہش نہیں کرتے تھے۔ ہمارے علاقے کا اکثر یہ رواج ہے کہ بعض لوگ بلا ضرورت خود بھی مسلح رہتے ہیں اور اگر توفیق ہو تو اپنے ساتھ ایک مسلح جھتہ بھی لئے پھرتے ہیں اور اس کے ذریعے لوگوں اور معاشرے میں اپنی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ساری زندگی میں نے نہ اُنہیں مسلح دیکھا ہے اور نہ اُن کے پاس کسی مسلح شخص یا باڈی گارڈ کو دیکھا ہے۔شادی،فوتگی دیگر تقریبات کے موقعے پر بقول داغؔ:

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

اکثر جنازہ پڑھنے کے بعد میت کی تدفین تک ٹھہرتے تھے اور قبرستان میں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہ اُن کے بیٹھنے کا خاص انداز تھا۔

۲) یارقند خان کو اللہ تعالیٰ نے لالچ اور حب مال کے مرض سے بچایا تھا۔موجودہ مادہ پرستانہ معاشرے میں تقریباً ہر کوئی اس کوشش میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاندانی، سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت کو استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ دولت اکھٹا کرے، جس کے لئے کئی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ یارقند خان کاٹلنگ بازار کے عین قلب میں کافی قیمتی اراضی کے مالک تھے۔وہ چاہتے تو وہاں ایک بڑی تجارتی منڈی قائم کرتے اور اُس میں کاروبار کر کے زیادہ سے زیادہ دولت کما سکتے تھے۔جس کے لئے اُن کے پاس وسائل اور ذرائع کی کمی نہیں تھی۔لیکن انہوں نے ایک عام مارکیٹ کے اُوپر بالا خانہ بنایا ہوا تھا جب وہ اپنے گاؤں میں ہوتے تو وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر اور آنے جانے والوں کے ساتھ ملتے تھے، اور اُن کی خاطر تواضع چائے پانی سے کرتے۔اس کے علاوہ وہ چاہتے تو ٹھیکہ داری کا پیشہ بھی اختیار کر سکتے تھے جو کہ اکثر لوگ کرتے ہیں۔اس کے لئے بھی اُن کے پاس مطلوبہ وسائل تھے لیکن انہوں نے ساری زندگی لوگوں کے ساتھ اُن کے تھانہ کچہری میں مدد کی یا اُن کے شادی، غمی میں شریک ہوتے رہے لیکن دولت کمانے کے چکر میں نہیں پڑے۔

۳) چیئرمین یارقند خان ایک وفادار اور مستقل مزاج شخص تھے وہ اول روز سے جس سیاسی

جماعت سے رابستہ رہے آخر دم تک اپنی وابستگی اُس کے ساتھ برقرار رکھی۔ وہ دوستوں کے دوست تھے
اُن کے دوستوں میں ہر عمر، ہر معاشی اور سماجی حیثیت کے لوگ شامل تھے۔ جن میں سے اکثریت اُن
کے ساتھ ہر وقت اور ہر حالت میں نظر آتے تھے۔ خواہ وہ اپنے حجرے میں بیٹھے ہوں یا شادی غمی یا کسی
دوسری تقریب میں شرکت کے لئے جا رہے ہوں، اُن کے دوستوں کی اکثریت اُن کے ہمرکاب ہوتی
تھی۔ ان میں سے بعض دوست چیئرمین صاحب کی زندگی میں انتقال کر گئے اور چیئرمین صاحب نے
اُنہیں اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے اللہ کے حضور حاضری کے لئے بھیج دیا۔ اور بعض دوستوں کی زندگی ہی
میں چیئرمین صاحب کو اللہ کی طرف سے بلاوا آ گیا اور اُن تمام دوستوں نے آہوں اور سسکیوں کے
درمیان چیئرمین صاب کو اپنے ہاتھوں سے سفرِ آخرت پر رخصت کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ زندگی بھر کسی شخص
کا چیئرمین صاحب کے ساتھ تعلق بن گیا ہو اور وہ تعلق چیئرمین صاحب کی زندگی میں ناراضگی میں بدل
گیا ہو۔ وہ دوستوں کے دوست تھے اور تمام دوستوں کے ساتھ دوستی آخری دم تک نبھائی۔

راقم الحروف آٹھ، نو سال تک اپنے بچوں کے علاج کے سلسلے میں امریکہ، کینیڈا قیام کے بعد
وطن واپس آیا تو اگلے ہی دن چیئرمین صاحب ملاقات کرنے اور راقم الحروف کو خوش آمدید کہنے
ساولڈھیر تشریف لے آئے۔ اُن سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور یہ دیکھ کر بے حد پریشانی ہوئی کہ اُن کی
صحت کافی خراب ہوگئی ہے، چہرے اور پیروں میں سوجن واضح دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا چند دن
میں آنے جانے والوں کا رش کچھ کم ہو جائے، تو میں چیئرمین صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے
مرض اور علاج کے بارے میں آگاہی حاصل کروں گا۔ وہ چند دن کیا گزرنے تھے کہ اس کے دوران ہی
اطلاع ملی کہ بندہ (چیئرمین صاحب) اپنے رب کے حضور حاضر ہونے چلا گیا۔ موت برحق ہے اور ہر
ذی روح کو یہ مزہ بالآخر چکھنا ہے۔ چیئرمین صاحب کی وفات ایک شخص کی وفات نہیں تھی بلکہ وہ ایک
انجمن تھے۔ درحقیقت اُن کے باقی رہ جانے والے دوست یتیم ہو گئے، اور علاقے بھر میں اور خاص طور
پر اُن کے دوستوں کے حلقے میں اُن کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جائے گی۔ درمیانی قد، گندمی
رنگت، ذرا آگے کو جھکے ہوئے اور دونوں ہاتھ سلام کے انداز میں ماتھے پر رکھے، مسکراتے چیئرمین اب

دیکھنے کونہیں ملیں گے بلکہ اُن کی یادیں،ہی باقی رہ گئیں ہیں۔

عزیزی ڈاکٹرشبیراحمدخان (فرزندچیئرمین صاحب) نے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو میں سخت اُلجھن میں پڑ گیا انکارتوممکن ہی نہیں تھالیکن لکھوں تو کیالکھوں،لکھنا تو میرا میدان ہی نہیں ہے البتہ اُن کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے یہ بے ربط جملے حاضر ہیں اگر قبول ہوں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ چیئرمین صاحب کے لغزشوں سے درگزر کا معاملہ فرمائے اور اُن کے حسنات کوقبول فرمائے اور اُن کی اولاد،دوستوں اورتمام مسلمانوں کواُن کےنقش قدم پر چلنے کی توفیق عطافرمائے۔(آمین)

ظہوراحمد (سابقہ چیئرمین یونین کونسل ساولڈھیر)

......☆......

بڑا آدمی

''لوگ کہتے ہیں کہ کسی ایک کے چلے جانے سے
زندگی رُک نہیں جاتی مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ
لاکھوں کے مل جانے سے بھی اُس۔۔۔۔ایک کی
کمی پوری نہیں ہوتی۔''

حسب عادت کتاب کی ورق گردانی میں مشغول تھا کہ ایک واقعہ نظروں سے گزرا، جسے میں نے بار بار پڑھا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ:

''ایک بزرگ کی محفل میں لوگ جمع تھے، بزرگ کی وعظ ونصیحت سے مجمع پر سحر طاری تھا۔اچانک ایک آدمی اُٹھتا ہے اور بزرگ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ:

''حضرت! بڑے آدمی کی تعریف کیا ہے اور پہچان کیسے ہوگی؟''

بزرگ نے برجستہ جواب دیا۔

''بڑا آدمی وہ ہے جس کی محفل میں کوئی بھی خود کو چھوٹا محسوس نہ کرے۔''

یہ واقعہ پڑھتے ہی ایک تڑپ سی پیدا ہوئی اور اپنے ماضی پر نظر دوڑانے لگا زندگی میں مختلف لوگوں سے میرا واسطہ رہا ہے جن میں بزرگانِ دین، علماء، سیاسی وسماجی شخصیات، شعرا ہر مکتبۂ فکر کے لوگ شامل ہیں۔ اگر مذکورہ بالا تعارف کو معیار قرار دیا جائے تو میں بلا تردد اور حلفاً یہ کہہ سکتا ہوں اور جتنے بھی لوگ یارقند خان سے واقف ہیں میری اس بات کی کی تائید کریں گے کہ یارقند خان وہ انسان تھے جو اس معیار پر پورا اُترتے تھے شاید یہ بات اُس بزرگ نے اُنہی کے بارے میں کہی ہے۔

یقیناً بڑے آدمی کی خوبی جو اس بزرگ نے بیان کی تھی، اس کی روشنی میں یارقند خان ''چیئر مین صاحب'' ہی بڑے آدمی ہونے کے حقدار ہیں۔ اُن کی محفل میں مجھ جیسا ناچیز بھی خود کو کبھی چھوٹا نہ سمجھتا۔ بلکہ اُن کی کوشش رہتی تھی کہ اُن کی محفل میں موجود ہر شخص کو یہ احساس دلائے کہ وہی اس محفل کی جان ہے وہ کسی بھی دوست کو عزت دینے میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیتے اور کہتے تھے کہ انسان کسی کو وہی کچھ دے سکتا ہے جو اُس کے پاس موجود ہو۔

میری خوش نصیبی ہے کہ میرا شمار اُن چند لوگوں میں ہوتا ہے جن کو یارقند خان کی قربت نصیب ہوئی۔ زندگی میں اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ ہلکے پھلکے انداز میں اُن کی ہر بات سبق آموز ہوتی۔ اُن کی کہی ہوئی باتیں کم از کم میرے لئے تو اقوال کا درجہ رکھتی تھی۔ میری شناسائی اُن سے 1986ء میں ہوئی اور تقریباً بیس سال اُن کی محفلوں میں گزارے۔ ان سالوں میں میں نے اُن کو کیسا پایا، اسے بیان کرنے یا لکھنے کو تو ایک زمانہ چاہیے۔ اُن کی زندگی کے ہر پہلو پر لکھنا میرے لئے ممکن نہیں۔

اب چونکہ یارقند خان کے اکلوتے فرزند جناب ڈاکٹر شبیر احمد خان نے ایک سعی شروع کی ہے کہ اپنے عظیم والد پر ایک کتاب مرتب کی جائے جو کہ زیادہ تر چیئر مین صاحب ہی کی تحریروں پر مشتمل ہو۔ مگر اُن کی یہ بھی خواہش ہے کہ ممکنہ حد تک اُن کے دوست بھی اُن کے متعلق اپنی یادداشت تحریری شکل میں بیان کریں۔ تو مجھے بھی یہ سعادت نصیب ہوئی کہ یارقند خان کی زندگی کے بارے میں اپنے مشاہدات کا اظہار کر سکوں۔

میری پہلی ملاقات اُن سے 1986ء میں ہوئی، جب میرے دوستوں نے اصرار کیا کہ ہم چیئر مین صاحب سے ملنے جاتے ہیں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ اُس وقت میں چیئر مین صاحب کو صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ہمارے علاقہ کے خان ہیں۔ ایک سیاسی رہنما ہیں، علاقہ کی معزز، موثر اور جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ علاقہ کے چند ہی سرکردہ رہنماؤں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ تو میں نے معذرت کر لی کہ اتنے امیر اور بڑے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا کم از کم

مجھے اچھا نہیں لگتا، یا خود کو اہل نہیں سمجھتا۔ دوستوں نے اُن کے مثبت رویے اور اعلیٰ ظرفی سے مجھے رام کرنے کی کوشش کی جن میں وہ کامیاب ہوئے اور میں اُن کے ساتھ جانے کے لئے راضی ہوا۔

ہم بازار ہی میں موجود اُن کے بالا خانے پہنچے جو کہ دراصل اُن کا ڈیرہ تھا۔ دیکھا تو ایک عام سی جگہ تھی جہاں باہر لان میں دو چار پائیاں رکھی ہوئی تھیں اور درمیان میں ایک میز پڑی تھی۔ چار پانچ دوستوں کے درمیان چیئر مین صاحب بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے اور جیسے ہی ہم پر نظر پڑی۔ با آواز بلند کہنے لگے کہ یہ تو شاہ حسین خان آگئے ہیں۔ ویسے یہ اُن کی عادت تھی کسی کے نام کے ساتھ خان لگے یا نہ لگے چیئر مین صاحب خان کہہ کر پکارتے۔ ہمارے آنے یا میرے آنے پر اتنی خوشی محسوس کی کہ میری حیرت کی انتہاء نہ رہی۔خود کمرے کے اندر گئے اور ایک دوسری چار پائی اُٹھانے لگے مگر حمید گل خان نے اُن کی یہ کوشش نا کام بنا دی اور چار پائی اُن سے لے کر باہر لے آئے۔مگر پھر بھی ہاتھ میں تکیہ اُٹھا کر ضرور لے آئے۔ ویسے وہ ہر کام خود ہی کرنے کے عادی تھے۔ حال احوال پوچھنے کے بعد جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہا کہ شاہ حسین خان کے لئے فروٹ تو حمید گل خان بھی لا سکتا ہے مگر دلبر خان جو کہ خود فروٹ کھانے کے شوقین ہے اور فروٹ کی پہچان بھی رکھتا ہے اور قیمت کا بھی پتہ ہے تو اس لئے یہ کام دلبر خان ہی کرے گا۔ دلبر خان بھی سینہ تان کر کھڑے ہو گئے جیسے واقعی یہ کام وہ ہی بہتر کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی دلبر خان فروٹ لینے سیڑھیوں سے اُتر گئے چیئر مین صاحب نے حمید گل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دلبر خان کو تو فروٹ کا پتہ ہی نہیں اس کے بعد چائے پئیں گے تو شاہ حسین خان چونکہ مہمان ہے تو کیک بھی لانا پڑے گا۔ اگر دلبر خان کو کیک لانے بھیجیں تو وہ گل خان کو پیسے نہیں دیتا اور اُلٹا گل خان پر بدمعاشی بھی کرتا ہے۔ فروٹ والا تو مفت نہیں دے گا اس لئے اسے فروٹ لانے کو کہا اور کیک تم اس لئے لاؤ گے کہ گل خان ویسے تو بہت خراب آدمی ہے مگر تمہاری عزت کرتا ہے۔ اس لئے تم چائے کا بھی آرڈر دو اور تازہ کیک بھی لے آؤ۔ حمید

گل کو سیڑھیوں سے واپس بلا کر کہنے لگے کہ حمید گل خان تمہیں تو پتہ ہے کہ چائے دس پندرہ منٹ بعد چاہیے ہوگی۔ مگر فقیر گل خان کہتا ہے کہ یہ بیوقوف چائے ساتھ ہی لیکر نہ آ جائے حالانکہ میں نے فقیر گل خان کو بتایا کہ حمید گل خان سمجھدار ہے ایسا نہیں کرے گا۔ حمید گل نے غصے کی حالت میں کہا کہ ممبر صیب ویسے ہی ہر بات میں ہڈی نکالتا رہتا ہے۔

یہ سب مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ بلا تکلف جس کے جی میں جو آ جاتا بولتا رہتا تھا۔ نوک جھونک بھی ہوتی رہتی، دوست آپس میں الجھ جاتے تو چیئر مین صاحب بحث کو طول دینے کی کوشش کرتے۔ مجھے بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں۔ چیئر مین صاحب ہر معاملہ میں مجھے ملوث کرنے کی کوشش کرتے، مجھے اجنبیت کا شائبہ تک نہ ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ روزانہ کی حاضری میرا معمول بن گئی۔

چیئر مین صاحب کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا مگر خاص طور پر کچھ دوست ایسے تھے جن کے بغیر محفل ادھوری لگتی تھی۔ ان میں مرحوم ڈاکٹر اجمل خان، ملک صاحب سبز علی خان مرحوم، مرحوم دلبر خان، رضوان اللہ راجا خان، فقیر گل ممبر صاحب اور گل محمد خان شامل تھے۔ ان چندلوگوں کا ذکر اس لئے کیا کہ یہ ہر وقت آپس میں الجھتے رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی برتری ماننے کو تیار نہ تھا اس لئے ان کی موجودگی ضروری تھی کہ چیئر مین صاحب کو آسانی ہوتی کہ کوئی بھی متنازعہ بحث کروائے جس کی وجہ سے یہ آپس میں لڑ پڑیں۔ پھر چیئر مین صاحب ان کے درمیان صلح کرواتے۔ ایک فریق کو جرمانہ کرتے اور جرمانہ خود ادا کرتے اور اسی جرمانہ کی رقم سے کوئی چیز منگوائی جاتی اور مل کر کھائی جاتی۔ اسی طرح ان ہی لوگوں کے دم سے رونق لگی رہتی تھی۔

دوستوں اور چائے کے علاوہ یار قند خان اخبار کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ اخبار تو ویسے ڈاکٹر اجمل بھی لیتے تھے ایک نہیں کئی کئی اخبار لیتے تھے مگر پڑھتے نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب اخبار خریدنے کے اتنے شوقین تھے کہ ایک مرتبہ مردان میں اخبار فروش سے کہنے

لگے کہ تمہارے پاس جتنے اخبار ہیں سب سے ایک ایک دے دو۔مگر چیئر مین صاحب اخبار پڑھتے اور پھر اس پر خوب تبصرہ بھی کرتے۔

چیئر مین صاحب اپنے ڈیرے (بالاخانے) میں ایسی جگہ پر بیٹھا کرتے تھے کہ جو بھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آتا۔سب سے پہلے چیئر مین صاحب کی نظر اُس آنے والے پر پڑتی۔اس میں ایک خاص منطق تھی مثلاً کوئی گداگر، کوئی محتاج، کوئی ضرورت مند ہوتا تو چیئر مین صاحب فوراً اُٹھ کے ان کے پاس چلے جاتے۔ ہاتھ ملاتے اور وہاں پر ہی اُس بندے کی ضرورت پوری کر کے رخصت کرتے۔

کسی کو کچھ دیتے تو مٹھی میں بند ہوتا، میرے سمیت کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے کبھی چیئر مین صاحب کو کسی کو کچھ دیتے ہوئے دیکھا ہے کہ کس کو کیا اور کتنا دیا۔شاید وہ اسی قول پر عمل کرتے تھے کہ دیتے ہوئے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو پتہ نہ چلے۔

اس میں دو حکمتیں اور بھی تھیں ایک یہ کہ جو حاجت مند کچھ مانگنے آتا دوستوں کے سامنے اس کی عزت مجروح نہ ہو اور دوسرا یہ کہ وہ اندر آ کر محفل میں بیٹھ کر خلل نہ بنے، اسی لئے اسے وہاں سے ہی رخصت کرتے۔ دیتے ہر کسی کو تھے، ظاہر کسی پر بھی نہ ہونے دیتے تھے اپنی خواہشات اور ضرورتوں کو ہمیشہ اپنے کنٹرول میں رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زندگی میں کبھی کسی چیز کی ضرورت یا کمی محسوس نہ ہوئی۔

عام لوگوں کی مدد فراخدلی سے کیا کرتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ مدد کرنے کا انوکھا انداز تھا۔ بالکل منفرد طریقے سے دوستوں کی مدد کیا کرتے تھے تاکہ ان کو احساس دلائے بغیر اُن کی مدد ہو۔مثلاً ایک دن میں اور فقیر گل خان بازار کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ میری چپلی غائب تھی، کسی چور نے اُڑا لی ہوگی۔ میں وہاں سے چپل پہن کر بالاخانہ پہنچا تو فقیر گل خان نے اُنہیں بتایا کہ اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہے۔

بات ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ چیئر مین صاحب نے فقیر گل خان سے کہا کہ مجھے کیا کہہ

رہے ہو، شاہ حسین کی چپلیاں میں نے تو نہیں چرائی، تم ساتھ گئے تھے اگر میں ساتھ ہوتا تو میں ان کو نئی چپلیاں لے کر دیتا۔ اب تو یہ میری ذمہ داری نہیں بنتی اور جیب سے تین سو روپے نکال کر فقیر گل خان کو دیتے ہوئے کہا کہ میں تو یہی دے سکتا ہوں۔ باقی تم لوگ جانو اور تمہارا کام جانے۔ چیئر مین صاحب کو معلوم تھا کہ بہترین چپلی دوسو روپے میں مل جاتی ہے اور وہ چپلی کی قیمت سے زیادہ دے رہے تھے مگر انداز ایسا تھا کہ ہمیں یہ احساس نہ ہو کہ چیئر مین صاحب ہم پر احسان کر رہے ہیں کتنے اعلیٰ ظرف کے مالک تھے۔

جب گاؤں کے گھر میں ڈاکٹر شبیر کے لئے علیحدہ کمرہ بنوایا، جو کہ ایک مکمل پورشن تھا تو ہم اکثر اُس دوران وہاں جاتے تھے اس وقت کے لحاظ سے جدید طرز کا کمرہ تھا۔ جب تیار ہوا اور میں نے دیکھا تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ 1984 میں جب میں سعودیہ میں تھا تو وہاں سے میں ایک قسم کا پردہ لایا تھا جو کہ آج کل عام ہے اور یہاں بھی ملتا ہے۔ وہ پردہ لکڑی کے موتیوں سے بنا ہوا تھا میری رائے تھی کہ وہ پردہ اسی کمرہ کے لئے انتہائی موزوں رہے گا۔ اور پھر میں اور فقیر گل خان وہ پردہ ساتھ لے کر وہاں لے گئے۔ چیئر مین صاحب نے اُس پردے کی اتنی تعریف کی کہ دل چاہا اگر اتنی قیمتی ہے تو واپس لے جایا جائے۔ بہر حال انہوں نے کہا کہ یہ پردہ کسی نے دیکھا ہی نہیں تو لگائے گا کیسے؟ اس لئے تم خود ہی اسے لگاؤ۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ بس مجھے داد دینے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے۔ پردہ میں اور فقیر گل خان نے لگایا۔ فقیر گل خان سے کہا ''تم تو خود کو عقل کل سمجھتے ہو چلو ایمان سے بتاؤ اس پردے کی قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہو؟ تم کیا کوئی بھی نہیں لگا سکتا۔ اتنی قیمتی چیز لانے پر شاہ حسین خان انعام کے حقدار تو بنتے ہیں ناں''۔ اور پھر مجھے جو انعام دیا مجھے بھی معلوم تھا اور چیئر مین صاحب کو بھی معلوم تھا کہ انعام کی رقم پردے کی قیمت سے دوگنی ہے۔ اسی طرح اور اسی انداز سے دوستوں میں سے ہر ایک کی مدد کیا کرتے تھے۔ شادی اور غمی کے دوران تو اپنا پورا حصہ ڈال دیتے تھے، مگر کسی کے ساتھ کتنی مدد کی دوسروں کو خبر نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ

مدد ہر ایک کی کرتے تھے۔

یارقند خان انتہائی نڈر اور بے باک انسان تھے۔ کہتے ہیں کہ سچے آدمی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس کا لہجہ ذرا سخت ہوگا۔ جو بھی بات ہوتی تھی دل میں نہ رکھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ کبھی کسی بات کو نہیں بھولتے تھے۔ اگر کسی کی کوئی بات بُری لگتی تو بار بار محفل میں اُسی بات کا ذکر کرتے تھے اور اتنی بار کرتے کہ بات کرنے والا پشیمان ہو جاتا تھا کہ میں نے کیوں ایسی بات کی ہے۔ اس لئے دوست اکثر کتراتے تھے کہ کہیں کوئی ایسی غلط بات منہ سے نکل نہ جائے یا ایسی کوئی حرکت سرزد نہ ہو۔ میرے خیال میں یہ اُن کا اصلاح کرنے کا طریقہ تھا جو کہ بہت کارآمد تھا۔

جب کوئی دوست ناراض ہو جاتا تھا تو اسے راضی کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جاتے۔ تب تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اُسے راضی کروا کر محفل میں شامل نہ کر لیتے۔ مہینے دو مہینے میں کم از کم ایک بار باہر جانے کا کوئی نہ کوئی پروگرام بناتے چاہے وہ کسی دربار پر جانا ہو یا مچھلی کے شکار کے لئے پنجاب جانا ہو۔ درباروں میں پیر باباؒ، بہادر باباؒ، مست باباؒ وغیرہ اور مچھلی کے شکار کے لئے پنجاب کے مختلف علاقوں میں جانا رہتا تھا۔

پروگرام سے پہلے باقاعدہ ایک لسٹ بنواتے۔ لسٹ بنانے کا کام اکثر فقیر گل خان کے ذمہ ہوتا تھا۔ کئی کئی دن اس پر بحث ہوتی رہتی پھر اتفاق رائے سے دن، وقت اور جگہ کا تعین ہوتا۔ تعداد کے لحاظ سے گاڑی کا انتظام ہوتا، اشیائے خورد و نوش کی فہرست تیار ہوتی۔ وقتاً فوقتاً دوستوں کے مطالبات کو شامل کیا جاتا۔ ضرورت کی ہر چیز لکھ دی جاتی تھی اور ہر ایک چیز کے سامنے علی الحساب خرچہ لکھا جاتا تھا۔ ضروری تھا کہ یہ سب چیزیں تحریری شکل میں موجود ہوں۔ لسٹ فائنل ہو جاتی اور مجموعی خرچہ کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔

مثلاً بیس بندے اور خرچہ چھ ہزار روپیہ ہوگا۔ تو چیئر مین صاحب جیب سے چار ہزار روپے نکالتے اور کہتے کہ باقی تم لوگ پورے کرو۔ باقی دوستوں پر تقریباً سو روپیہ فی نفر خرچہ

آئے گا۔مگر حمید گل خان کی جگہ میں چندہ جمع کروں گا یہ سنتے ہی دلبر خان ناراض ہو جاتے۔ ملک صاحب آگ بگولہ ہو جاتے کہ نہیں جو بھی جائے گا اپنا چندہ خود دے گا ورنہ پھر ہمارا چندہ بھی دو گے۔اسی طرح چار پانچ بندوں کا چندہ مزید چیئر مین صاحب کے ذمہ آجاتا۔اس میں بھی فلسفہ یوں تھا کہ چیئر مین صاحب ذہنی طور پر دوستوں کو پروگرام میں حصہ دار بنانا چاہتے تھے تاکہ ہر کوئی دلچسپی لے کہ یہ تو میرا ہی پروگرام ہے۔ پھر باہمی مشاورت سے چندہ کے لئے ''خزانچی'' ڈھونڈا جاتا۔ یہ پروگرام کا سب سے کٹھن مرحلہ ہوا کرتا تھا۔مثلاً چیئر مین صاحب کہتے کہ ملک صاحب کے پاس چندہ ہوگا۔تو راجہ خان یکدم سے اعتراض کرتے اور گل خان تو یہاں تک کہہ دیتے تھے کہ اگر چندہ ملک صاحب کے پاس ہوگا تو میں نہیں جاؤں گا۔ ملک صاحب غصہ میں آجاتے اور گل خان اور راجہ خان کو برا بھلا کہتے ،اگر راجا کو منتخب کیا جاتا تو ملک صاحب اور دلبر خان معترض ہوتے۔کئی کئی دن تک بغیر کچھ فیصلہ کئے محفل برخاست ہوتی۔ بلکہ چیئر مین صاحب یہ فیصلہ نہ ہونے دیتے تھے۔کبھی ووٹ دینے کی بات ہوتی تو کبھی ٹاس پر فیصلہ ہوتا۔ بالآخر فیصلہ تو ہو جاتا اور ایک آدمی کا انتخاب ہو جاتا مگر اس پر مزید دو نگران مقرر کئے جاتے۔چیئر مین صاحب کی خواہش ہوتی کہ جن کے پاس چندہ ہو اُسے بدنام کیا جائے تاکہ آئندہ پروگرام کے لئے کوئی نیا بندہ ڈھونڈنا پڑے۔

جب متعلقہ جگہ پہنچ جاتے تو چیئر مین صاحب کسی بھی کام کرنے میں سب سے آگے آگے ہوتے۔ان کو دیکھ کر سوائے ملک صاحب کے ہر کوئی کام کرنے میں مگن رہتا تھا۔رات بھر خوب گپ شپ لگی رہتی۔ چندے کے حساب کتاب پر اکثر جھگڑا ہو جاتا پھر چیئر مین صاحب صلح کرواتے ایک فریق کو جرمانہ کرتے اور جرمانہ خود ادا کرتے۔

چیئر مین صاحب ہر پروگرام اور اس میں شامل ہر ایک دوست کا بغور اور باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے۔ ہر بندے کی حرکتوں کو نوٹ کرتے اور اکثر واپس آکر سارے واقعات اپنی ڈائری میں لکھتے اور سب کچھ جیسے اور جس حالت میں ہوتا اُسی طرح ہی بیان کرتے۔

اُن کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا اور بازار میں ڈیرہ جمانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کسی بھی گاؤں یا علاقہ سے کوئی آئے تو اُن سے ملنے میں دقت نہ ہو یہی وجہ تھی کہ کبھی بھی بالا خانہ دوستوں سے خالی نہ ہوتا تھا۔

ویسے تو چیئرمین صاحب کے ہر دوست کو یہ یقین تھا کہ وہی اُن کا خاص دوست ہے وہی سب سے قریب ہے مگر حقیقت میں میرے بہت مہربان تھے۔ جو بات کسی کو نہ کہتے وہی باتیں مجھ سے کہتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ دوستوں سے ناراض ہوئے یا چند دوستوں نے انہیں ناراض کیا۔ جس کا ذکر کسی سے نہ کیا، مگر مجھے سارا واقعہ بیان کیا اور میں نے محسوس کیا کہ دوستوں کی جدائی کی وجہ سے بہت دُکھی اور غمگین ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دوستوں کی دوری نے اُنہیں کمزور کر دیا ہے۔ چیئرمین صاحب کہتے تھے کہ میرے دوست ہی میرا اثاثہ ہیں اور میں اس اثاثے کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے میری بساط سے زیادہ عزت دی۔ جب محمد خان جونیجو پاکستان کے وزیراعظم تھے تو ایک دیہی کونسل بن رہی تھی۔ چیئرمین صاحب نے مجھے کاٹلنگ کے دیہی کونسل کا صدر بنوایا حالانکہ کافی نامور لوگ اس عہدہ کے حصول کے لئے سرگرم تھے۔ پھر جب آفتاب خان شیر پاؤ وزیراعلیٰ تھے۔ چیئرمین صاحب کے ہاں اُن کے آنے کا پروگرام بنا۔ ایک بڑے جلسے کا انعقاد کروایا گیا۔ کئی وفاقی اور صوبائی وزراء وزیراعلیٰ سمیت شامل تھے۔ اس عظیم الشان جلسہ کے اسٹیج سیکرٹری کے لئے بھی چیئرمین صاحب نے میرا ہی انتخاب کیا اور میں نے ہی اُن کی وساطت سے پورے علاقہ کی نمائندگی کی۔ عرض کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ دوستوں کو عزت دینا اپنی عزت سمجھتے تھے۔

میں نے ایک دن چیئرمین صاحب سے کہا آپ اچھا نہیں کرتے۔ لوگوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے کہنے لگے کہ میں نے حضرت علیؓ کا ایک قول سنا ہے کہ زمین پر بیٹھنے والے کبھی گرتے نہیں۔

''اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اُن کو بلند درجات عطا فرمائے۔ اُن کے بیٹے ڈاکٹر شبیر احمد خان کو ہمت اور حوصلہ دے کہ اُن کے دوستوں سے رشتہ اسی طرح ہی استوار رکھیں تا کہ چیئر مین صاحب کی روح کو سکون نصیب ہو۔'' آمین

شاہ حسین

۱۔۱۔۲۰۱۷

......☆......

چیئر مین صاحب کی یاد میں

جناب حاجی یارقند خان ایک عظیم انسان تھے۔ وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ پورے علاقہ میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ انتہائی سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ہر ایک کو دونوں ہاتھوں سے سلام پیش کرتے تھے۔ چیئر مین صاحب پر کبھی کسی نے سلام میں پہل نہیں کی۔ وہ معاشرے سے بہت واقف تھے۔ اور اُس کے طورطریقوں کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ یارقند خان کاٹلنگ بازار میں اپنے بالاخانہ کو حجرے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ پابندی سے صبح بالاخانہ آتے تھے اور تقریباً 2 بجے تک بالاخانہ میں رہتے تھے۔ علاقہ بائیزی سے جتنے لوگ اُن سے ملنے آتے اُن سے اسی بالاخانہ میں ملاقات کرتے تھے۔ میں جب 1990ء میں فوج سے پینشن پر آیا تو اسی بالاخانے کے نزدیک میں نے کاروبار شروع کیا۔ چیئر مین صاحب کے ساتھ ہمارے بابوزئی کاٹلنگ کے بہت سارے دوست ہوتے تھے۔ اسی دوران اُن سے میری ملاقات ہوئی اور میں بھی اُن کی پارٹی میں شامل ہوا۔

یارقند خان کے دوست بہت زیادہ تھے۔ جن میں خرکی سے حاجی رحیم شاہ، میاں خان سے نورکمال خان، بابوزئی سے حاجی گل غفور خان، بدر بانڈہ سے گل محمد خان، پیلاگی سے حاجی صادق روز پرنسپل صاحب، جمال گڑھی سے چیئر مین شمس الدین اور گل سید شاہ اور ساولڈھیر سے حاجی دلاور شاہ خان چیئر مین میرداد خان اور قیمت گل شامل تھے۔ گاؤں میں اُن کے زیادہ تر دوست بابوزئی کاٹلنگ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ پورا دن بالاخانے میں موجود ہوتے تھے۔ ان دوستوں نے کبھی یارقند خان کو ایک لمحہ بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ وہ صبح جب بالاخانہ میں آجاتے تو پہلے ایک دوست کو پیسے دے کر ہر قسم کے

فروٹ لاکر میز پر رکھ دیتے تھے۔اسی دوران جب دوست آجاتے تو اُن کی خاطر مدارت کرتے۔جب دوست جانے کی بات کرتے تو چیئرمین صاحب جواب میں کہتے۔کہ چلو ایک دفعہ پھر چائے پی کر چلے جاتے ہیں۔اکثر چائے کے بہانے دوستوں کو دیر تک اپنے پاس رکھتے تھے۔

یارقند خان اپنے دوستوں کی وجہ سے بابوزئی کاٹلنگ سے بہت محبت رکھتے تھے۔اُس وقت کے ڈی سی مردان عبدالوکیل شاہ صاحب اُن کے کالج کے زمانے کے دوست تھے۔اسی دوران صوبے کے وزیراعلیٰ آفتاب شیرپاؤ تھے۔اس کے کہنے پر ڈی سی صاحب نے یارقند خان کو پیپلز پارٹی میں شمولیت پر مجبور کیا۔جب پروگرام بنا اور شیرپاؤ تشریف لائے اوراس نے چیئرمین صاحب سے ترقیاتی کاموں کے بارے میں پوچھا۔تو چیئرمین صاحب نے بہت سے کام بابوزئی کاٹلنگ کے بتائے۔جس میں ندی پر پل بھی شامل تھا۔

یارقند خان بہت سخی تھے۔غریب اور نادار لوگوں کی مدد کرتے تھے۔بالاخانے میں جب چیئرمین صاحب کے ساتھ دوست موجود ہوتے تو اسی وقت غریب اور نادار لوگ بالاخانے میں پہنچ جاتے۔چیئرمین صاحب بہت ہوشیاری سے ان کی مدد کرتے تھے۔ان کی چارپائی بالکل دروازے کے سامنے ہوتی تھی۔کوئی بندہ نیچے سے اوپر آتا تو اُن کی نظر اس پر پڑتی۔اگر وہ غریب اور نادار ہوتا تو چیئرمین صاحب فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چلے جاتے تھے۔اور چپکے سے اس کی مدد کرکے واپس آتے۔ایک دفعہ چیئرمین صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک بندہ مجھ سے پلاسٹک کی ایک میز اور 6 عدد کرسیاں مانگ رہا ہے۔آپ اس کی قیمت معلوم کریں تاکہ خرید کر اس کو دے دیا جائے۔میں نے پوچھا کہ چیئرمین صاحب یہ بندہ کون ہے۔اُنہوں نے جواب میں بتایا کہ میں اُس کو نہیں جانتا۔لیکن جب صبح میں گھر سے آتا ہوں۔تو یہ بندہ راستے میں مجھے ملتا ہے۔

یارقند خان اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔مہینے یا دو مہینے بعد تمام دوستوں کیلئے دعوت کا اہتمام کرتے تھے۔دوستوں کو تاکید کرتے تھے کہ کھانے کیلئے ایک یا دو گھنٹہ پہلے آئیں تاکہ گپ شپ ہوجائے۔ماہِ رمضان میں بھی ایک یا دو بار افطاری کا بندوبست کرتے تھے۔دوستوں کے

ساتھ کبھی پیر بابا اور کبھی بہادر باباؒ جاتے تھے اور کبھی پنجاب میں مچھلی پکڑنے کا پروگرام بناتے۔

عید کے موقع پر دوست چیئرمین صاحب کو عید مبارک دینے کیلئے اُن کے گھر چلے جاتے تھے۔ چیئرمین صاحب پہلے سے دوستوں کو بتا دیتے تھے کہ سب دوست اکھٹے ایک وقت پر آئیں۔ چیئرمین صاحب بہت سی چیزیں گھر سے لاکر کمرے میں اکھٹے رکھ دیتے۔ اور دوستوں کو اپنے ہاتھوں سے پیش کیا کرتے تھے۔ بڑی عید پر دوست جب عید مبارک کیلئے گھر تشریف لے جاتے۔ تو اُن کو تِکے کھلاتے تھے۔

یارقند خان کو مجھ پر بہت بھروسہ تھا۔ پیسوں کا لین دین اکثر میرے ہاتھ پر کرتے تھے۔ زمینوں میں جتنے درخت ہوتے وہ میرے ہاتھوں بیچتے۔ چیئرمین صاحب کے زمیندار بھی میری بہت قدر کرتے تھے۔ ایک دفعہ چیئرمین صاحب نے بتایا کہ انہیں بہت خوشی ہوئی ہے۔ کہ شکرتنگی کے زمیندار آپ کی بہت عزت کرتے ہیں اور آپ سے بہت خوش ہیں۔

یارقند خان مجھ پر بہت مہربان تھے۔ مجھے لکڑی کے کاروبار کے لیے جگہ مہیا کی۔ مہینہ پورا ہونے پر میں نے نور غلام استاد کو بتایا کہ چیئرمین صاحب سے معلوم کرے۔ کہ میرا کرایہ کتنا بنتا ہے۔ چیئرمین کو جب اس بات کا پتہ چلا تو وہ جلال میں آگئے اور غصے سے بولے۔ آپکا کوئی کرایہ نہیں۔

ایک دفعہ چیئرمین نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر شبیر کے لئے ایک کلینک کا بندوبست کیا جائے۔ میں نے مستری کو بلاکر کام شروع کیا۔ جب لنٹر تیار ہوا تو لنٹر کیلئے میں نے اپنا شٹرنگ استعمال کیا۔ بعد میں چیئرمین صاحب نے مجھے بتایا کہ شٹرنگ کا بل بنا کر اُن سے پیسے وصول کروں۔ انہوں نے کئی دفعہ بل بنانے کا کہا اور میں انکار کرتا رہا۔ آخر انہوں نے دوستوں کی ایک کمیٹی بنائی اور اُن سے کہا۔ کہ جیسے بھی ہو صوبیدار صاحب کو پیسے ادا کئے جائیں۔

ایک دفعہ میں لکڑی لینے کیلئے مردان جا رہا تھا۔ کہ فلائنگ کوچ میں میرے جیب سے کسی نے 9000 روپے نکالے۔ میں نے واپس آکر چیئرمین صاحب کو بتایا۔ وہ بہت پریشان ہوئے اور مجھے کئی دفعہ پیسے دینے کی کوشش کی لیکن میں انکار کرتا رہا اور پیسے نہیں لیے۔ چیئرمین صاحب ہمارے ٹال میں

با قاعدگی سے آتے تھے۔ اور نثار سے کام کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور جب سیل زیادہ ہوتی تھی تو خوش ہوجاتے تھے۔ چیئرمین کی یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ دوستوں کے نقصان پر غمگین ہوتے تھے اور دوستوں کے منافع پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا کلینک جب تیار ہوا تو میں نے جگہ چھوڑنے کی کوشش کی۔ اسی دوران چیئرمین صاحب کو پتہ چلا۔ راجہ خان میرے پاس آئے۔ کہ آپ کو چیئرمین صاحب یاد کررہے ہیں۔ چیئرمین صاحب نے ملنے پر مجھے بتایا۔ کہ میں نے سنا ہے کہ آپ جگہ چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ ڈاکٹر صاحب کا کلینک شروع ہوجائے۔ تو مریض پریشان ہونگے۔ اسی وجہ سے جگہ چھوڑ رہا ہوں۔ چیئرمین صاحب نے کہا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے آپ اپنا کام جاری رکھیں اور آخر دم تک وہ جگہ میرے پاس رہی اور چیئرمین صاحب نے مجھ سے کرایہ بھی وصول نہیں کیا۔

یارقند خان سب دوستوں پر مہربان تھے۔ جب بھی کسی دوست کی خوشی غمی ہوتی تو چیئرمین صاحب اپنی طرف سے اس کی مدد کرتے تھے دوست بھی انتظار میں ہوتے تھے۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو بتاتے کہ چیئرمین صاحب کچھ نہ کچھ مدد کریں گے۔

یارقند خان مغرب کی نماز کے وقت بالا خانے میں آجاتے تھے۔ اور عشاء کی اذان تک وہاں رہتے تھے۔ میں بھی روزانہ اُن کیلئے آجایا کرتا تھا۔ باقی دوستوں میں بھی کوئی نہ کوئی آتا۔ ہم دونوں جنازگاہ تک اکھٹے چلتے تھے اور وہاں سے الگ ہوجاتے تھے۔ چیئرمین کو ہر ایک دوست کی قابلیت کا پتہ تھا میرے ساتھ بہت محبت اور پیار کرتے تھے کبھی میری توہین نہیں کی اور آخر دم تک ہم ایک دوسرے سے خوش تھے۔

ساولڈھیر میں ایک نماز جنازہ تھا۔ چیئرمین نے بتایا کہ چلو چلتے ہیں جمال گڑھی میں روٹی کباب لیکر بخت بلند خان کے پمپ پر بیٹھ کر روٹی کھائیں گے۔ اور ساتھ والی مسجد میں نماز پڑھ کر جنازہ کیلئے ساولڈھیر چلے جائیں گے۔ لیکن اتفاقاً جمال گڑھی میں کباب نہیں ملا اور نور غلام استاذ نے روٹی اور پکوڑے لیے اور ہم دوستوں نے پمپ پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بعد میں ہم ساولڈھیر گئے اور جنازہ میں

شرکت کی۔ جنازہ پڑھنے کے بعد ظہور خان سے ملنے گئے جو اُن دنوں امریکہ سے آئے تھے۔ یہ چیئر مین صاحب کا آخری پروگرام ثابت ہوا۔

اس کے بعد وہ بیمار ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں ہسپتال میں داخل کرایا۔ اسی دوران ہسپتال سے ڈسچارج ہوکر وہ گھر تشریف لائے اور پھر دوبارہ بیمار ہونے پر واپس ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ہم ہسپتال میں ساتھ تھے کہ 23 دسمبر بروز ہفتہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گاؤں واپس آئے۔ اگلی رات اُن سے مل کر دوست گھر چلے گئے۔ اور اُن کے ساتھ شاہد خان اور نور محمد خان رہ گئے۔ چیئر مین کو رات دوبارہ تکلیف ہوئی۔ تو ڈاکٹر صاحب انہیں انزرگی ہسپتال لے گئے اور 24۔25 دسمبر 2006 کی درمیانی شب کو تقریباً تین بجے ہسپتال میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ رات کو ہمیں فون پر اطلاع دی گئی۔ کہ چیئر مین صاحب اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے ہیں۔ میں نے رات کو چار بجے جا کر ریداد گل بابو، فقیر گل خان، بغداد شاہ اور نور غلام کو خبر کی اور اُن کو ساتھ لیکر چیئر مین صاحب مرحوم کے گھر گئے اور انہیں غسل دیا اور جنازے اور تدفین کے انتظام کے لیے محمود زمیندار کو بلایا اور اُن کے سفرِ آخرت کی تیاری شروع کی۔

یارقند خان نے مجھے وصیت میں دو باتیں بتائیں ایک اس سے متعلق تھی کہ انہیں کہاں دفن کرنا ہے اور دوسری اُن کے بیٹے ڈاکٹر شبیر کے متعلق تھی کہ وہ ابھی ناتجربہ کار ہے اس لیے اُسے اکیلا نہیں چھوڑنا ہے ہم سب کو چیئر مین صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ مرنا حق ہے ہر کسی نے مرنا ہے۔ لیکن خوشی اسی بات کی ہے کہ ہم نے دل سے آخری وقت تک اُن کی خدمت کی۔ اللہ چیئر مین صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرماویں۔ آمین

صوبیدار ناہید شاہ خان

......☆......

یادِرفتگاں

میں خود تو رفیق ہوں لیکن بعض دوستوں کی مہربانی سے عاصی بھی ہوں۔ ایسے لوگ اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جو یار بھی ہوں اور قند بھی۔

ایک ماہ پہلے ڈاکٹر شبیر احمد خان نے شاعری کے ناطے میری اعزاز میں ایک پر تکلف ظہرانے کا اہتمام کیا۔ اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ اُن کا ارادہ ہے کہ اپنے والد محترم مرحوم یار قند خان کی تحریروں کی ایک کتاب شائع کرے۔

مسودہ تو مجھ تک نہ پہنچ سکا اور حکم ملا کہ کتاب کیلئے میں بھی کچھ لکھوں۔ یہ کام اس لحاظ سے ذرا مشکل لگا کہ میری ادبی سرمایے کا زیادہ تر حصہ پشتو زبان میں ہے اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے بھی میں پشتو ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک ادیب ہونے کے ناطے علامہ اقبال اور غالب کی شاعری اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر سے استفادہ کرتا رہتا ہوں لیکن اُردو زبان کو ذریعۂ اظہار کم ہی بناتا ہوں۔

میرے خیال میں مذکورہ کتاب کو اُردو زبان میں چھاپنے کا فیصلہ اس لیے ہوا کہ مرحوم چیئرمین صاحب مسلم لیگ سے وابستہ تھے جو ایک قومی سطح کی جماعت ہے۔ اس لیے قومی زبان کا انتخاب ٹھیک تھا۔ پشتونوں کی کوئی کتاب اُردو میں چھاپنا قومی یک جہتی کو فروغ دینا ہے جو ایک احسن قدم ہے۔ مزید یہ کہ اُن کے فرزند ارجمند ڈاکٹر شبیر احمد خان نہ صرف طبی حاذق (سپیشلسٹ) ہیں بلکہ سائنس، فلسفے اور نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ مستقبل قریب میں نہ سہی بعید میں سہی لیکن ملک وقوم پر اُن کی قابلیت ضرور آشکار ہوگی اور وہ اُردو اور اُردو دان طبقے کے لیے ایک سرمایہ سے کم نہیں ہوں گے۔ مرحوم چیئرمین صاحب کی تحریریں اُن کی شخصیت کی طرح دل آویز ہوں گی۔ یہ کتاب اُن کے خاندانی پس منظر علاقہ کی ثقافت، پشتونیت اور سیاست کی آئینہ دار ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ دوست احباب

سے اُن کی محبت اور دوستانہ مزاج کا بھی ایک نمونہ ہوگی۔

ویسے بھی ایک ہمہ وقت حاضر باش قریبی دوستوں کی محفل میں مرحوم ہمیشہ شمع فروزاں رہتے تھے۔ علاقے کے خان ہونے کے باوجود حلقۂ احباب میں اُن کا کردار ایک خادم جیسا تھا۔ مزاج میں تکبر کا دور سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم سے بڑھ کر اگر کوئی دشمن بھی ہوتا تو خان مرحوم کی ملنساری اور نرم مزاجی سے موم ہو جاتا۔ خود آوارہ دِل جیسے تھے لیکن ہر دلعزیز تھے۔ اسد اللہ خان غالب کا شعر یاد آتا ہے۔

لیتا نہیں میرے دل آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

یارقند خان محموتی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ ایک بڑا خاندان ہے اور پورے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس خاندان میں اور بھی بڑے لوگ گزرے ہیں جن کی خدمات کے لوگ معترف ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کونسا ملکہ تھا کہ یارقند خان ان میں سب سے بڑا آدمی تھا اور پورا علاقہ اس کا گواہ ہے اپنی عزت اور مقام کے باوجود موصوف کی کسی حرکت وسکنت سے نمود و نمائش کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ غریب مظلوم اور بے بسوں کی دادرسی ان ہی کی دہلیز پر کرتے۔ یہ بھی دیکھنے اور سننے میں آیا ہے۔ کہ یتیم اور بیواؤں کو راتوں رات حصہ بقدر جُسہ اُن کے دروازے پر پہنچاتے۔ دینداری میں زاہد اور شیخ تو نہ تھے لیکن علماء اور پارسا لوگوں کے بہت قدردان تھے۔ چاہیے بھی یہ کہ بندہ شہر خموساں میں بسے اور ہستی سماج پر اُسکا ڈھنکا بجتا رہے۔

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

(محمد رفیق عاصی)
الشفیق دواخانہ کاٹلنگ
۲۰۱۷-۱-۱۴

محبت کا پیکر

یارقند خان ایک عظیم انسان تھے۔ اُن کے بہت زیادہ دوست تھے۔ دوستوں پر وہ بہت اعتماد کرتے تھے ہر بات میں دوستوں کے ساتھ مشورہ کرتے تھے۔ چیئرمین صاحب کے ہر دوست کو یہ یقین تھا کہ میرے ساتھ ہی چیئرمین صاحب خاص محبت رکھتے ہیں۔ ہر کسی کو اچھے نام سے پکارتے تھے۔ ہر ایک کو بات کرنے کا موقع دیتے تھے۔ کسی کی بات اچھی نہ لگتی تو اچھے انداز میں تنقید بھی کرتے تھے۔ اگر کوئی دوست معمولی سا احسان بھی کرتا تو ساری عمر اُس کا ذکر کرتے تھے۔ کوئی دوست اگر تحفہ لاتے تو چیئرمین صاحب اندازاً اس کی قیمت دل میں لگاتے اور کسی نہ کسی بہانے سے اُس سے کئی گنا زیادہ لوٹا دیتے تھے۔

چیئرمین میٹھی چیزیں پسند کرتے تھے میں کبھی کبھار اُن کے لئے بدایونی پیڑے لاتا تھا تو بہت خوش ہوتے۔ مجھ سے چیئرمین صاحب خاص محبت رکھتے تھے۔ میں اگر کبھی دو تین دن مسلسل محفل سے غیر حاضر رہتا تو نور غلام اُستاد یا کسی اور ذریعہ سے اطلاع بجھواتے اور میں حاضر ہو جاتا۔

چیئرمین صاحب سارے دوستوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کی مہمان نوازی مشہور تھی۔ اُن کی محفل ہر وقت سجی رہتی تھی۔ چائے، فروٹ، کباب اور بوتلیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے ساتھ اُن کا رویہ دوسرے دوستوں کے مقابلے میں ترجیحی ہوتا تھا۔ وہ مجھے خان کہہ کر پکارتے تھے اور کھانے کی چیزوں میں جو چیز اُن کو اچھی لگتی تھی وہ مجھے دے دیتے تھے۔ اس پر بعض دوست خفہ بھی ہو جاتے تھے لیکن اُن کے رویے میں فرق نہیں آتا تھا۔

1998ء کی بات ہے کہ میں حج بیت اللہ کے لئے جا رہا تھا۔ چیئرمین صاحب نے میرے اعزاز میں ایک دعوت کی جس میں سارے دوست مدعو تھے۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے اعلان کیا

کہ سارے دوست باری باری تقریر کریں اور جس نے خان کی زیادہ تعریف کی اُس کو انعام ملے گا۔ اُس دن دوستوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تقریر میں میری تعریفیں کیں اور چیئر مین صاحب سے انعام وصول کیا۔ سب اس پر بہت خوش ہوئے لیکن میرا حال اور تھا۔ مین سوچ رہا تھا کہ اس عظیم شخصیت نے مجھے کتنی عزت دی اور دل ہی دل میں انہیں لاتعداد دُعائیں دیں۔

چیئر مین صاحب کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے بعض دوست معمولی باتوں پر اُن سے خفہ تھے۔ میں ہر دوست کے گھر گیا اور اس کو راضی کر کے اُن کے پاس لے آیا جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔ اپنے آخری دنوں میں چیئر مین صاحب کو اندازہ تھا کہ اُن کا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ وہ حیات آباد میڈیکل کمپلیکس میں داخل تھے اور دوست ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ایک رات میں بھی اُن کے ساتھ تھا اور اُن کے پاؤں دبا رہا تھا۔ رات کے ایک بجے اُنہوں نے سارے دوستوں کو متوجہ کیا اور کہا کہ وہ اُنہیں اپنی آخری وصیت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب بہت حیران ہوئے کیونکہ بظاہر وہ بالکل ٹھیک لگ رہے تھے۔ انہوں نے وصیت میں ہمیں چند باتیں بتائیں۔ اگلی صبح ڈاکٹروں نے اُنہیں ڈسچارج کیا کیونکہ اُن کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ وہ ہسپتال سے واپس آئے لیکن دو ہفتے بعد اُن کی موت واقع ہوئی۔ اُن کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ بھی شکر کا مقام ہے کہ اُن کے فرزند ڈاکٹر شبیر اپنے والد کے دوستوں سے رابطے میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کی بہت عزت کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے ذریعے اُن کے دوستوں کو ایک بار پھر یکجا کر دیا ہے۔

اتنی بڑی حیثیت کے باوجود یار قند خان میں غرور اور تکبر نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ میں نے زندگی میں اُن جیسا شخص نہیں دیکھا۔ آخر میں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جب سے وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں میں روزانہ پانچ وقت دُعاؤں میں اُنہیں یاد کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

حاجی بخت بلند خان
جمال گڑھی

علماء کے قدردان

والدین کے ساتھ محبت اور عقیدت انسان کی گھٹی اور سرشت میں داخل ہے جو اپنی اولاد کے لئے کسی سرمایہ سے کم نہیں ہوتے۔ اسلام نے بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کی تلقین اس طرح کی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں رب کریم نے اپنی عبادت اور حق بندگی ادا کرنے کا حکم دیا ہے وہاں برابر میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا بھی حکم دیا ہے جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا. اور دوسری جگہ فرمایا ہے'' اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْکَ'' (سورۃ لقمان)۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے وجود اور پیدا ہونے کے دو سبب ہیں (۱) حقیقی سبب (۲) ظاہری سبب۔

انسان کے وجود کا حقیقی سبب، بلکہ تمام موجودات کا حقیقی سبب تو ذاتِ باری تعالیٰ ہے کہ اسی نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے اور ظاہری سبب انسان کے وجود کا والدین ہی ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ جہاں کہیں اپنی حق بندگی کی ادائیگی کا حکم دیتے ہیں وہاں متصلاً والدین کے ساتھ حسن برتاؤ کا حکم بھی دیتے ہیں تاکہ سبب حقیقی کے ساتھ سببِ ظاہری کا ذکر بھی ہوجائے۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید سے غرض یہ ہے کہ برادر محترم ڈاکٹر شبیر احمد جو اپنے والد محترم یار قند خان مرحوم کی حیات پر ایک کتاب تحریر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لئے بندۂ ناچیز کو بھی چند کلمات بطور تقریظ لکھنے کے لئے کہا۔ سواپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے باوجود تعمیل حکم سے چارۂ کار نہیں۔

یہ ڈاکٹر شبیر احمد خان کے والد محترم جناب یار قند خان مرحوم کا تعارف نہیں بلکہ تذکرہ

ہے کہ موصوف کسی تعارف کا محتاج نہیں بلکہ بمصداق فارسی خوانان ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' اہل علاقہ کے لئے اس کا نام سننا ہی کافی ہے۔ مرحوم یارقند خان علاقہ بائیزئی کاٹلنگ کے ایک با اثر اور صاحبِ حیثیت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں وہ سیاسی اور سماجی شخصیت تھے اور بہت ہردلعزیز شخصیت تھے۔ عوام وخواص میں اس کی مقبولیت کے کئی وجوہات تھیں۔

ایک یہ کہ وہ خدمتِ خلق کا جذبہ رکھنے اور عوام میں گھل مل کر رہنے کے عادی تھے۔ تھانہ کچہری میں عوام کے مسائل حل کرنے ہوں یا صلح ومصالحت کے جرگے میں شرکت ہو۔ وہ ہمیشہ ان میں پیش پیش رہتے جو دیہی زندگی کا خاصہ اور کلچر ہے لیکن وہ اس میدان کے روایتی کھلاڑیوں کی طرح ہرگز نہ تھے کہ ظاہر میں غریبوں کا ہمدرد بن کر باطن میں حکام بالا سے ملی بھگت کر کے اپنی جیب گرم کرے اور حصہ بقدر جثہ لینے کی خاطر غریب اور سادہ لوح دیہاتی لوگوں کا استحصال کرے پھر اپنی عیاری اور چرب زبانی سے انہیں زیر احسان بھی بنائے اور ظاہر اور باطن کے اس کھلے تضاد کے باوجود بھی اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے بقول غالب :

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دھوکا دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا

لیکن مرحوم یارقند خان ایسے ہرگز نہ تھے وہ کم گو اور سنجیدہ انسان تھے وہ زبان کی صفائی کے ہتھیار کے وصف سے عاری تھی یہی وجہ ہے کہ کئی بار الیکشن میں حصہ لینے کے باوجود کبھی جیت نہ سکے کہ اس کے لئے عیاری اور زبان کی صفائی بھی ضروری ہوتی ہے لیکن مرحوم موصوف کا عقیدہ تھا ''نام نہیں کام'' سو اپنے اس عقیدہ کو خوب نبھایا اور جو کام اس کے بس میں ہوتا اس میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

چند ماہ قبل تحصیل کاٹلنگ کے دفتر میں بندہ نے ایک سادہ لوح ان پڑھ شخص کو دیکھا جو اپنے کسی کام کے لئے آیا تھا اور غالباً دھکے کھا کھا کر خوب رگڑا گیا تھا وہ کہہ رہا تھا ''یرہ یارقند خانہ نن دے ارمان راغے'' اور اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ان کلمات پر بے

ساختہ میرے کانوں میں ایک پرانے ہندوستانی گیت کے بول گونجنے لگے کہ ''تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد''۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مرحوم موصوف بے لوث خدمت کے قائل تھے وہ گفتار کے غازی بالکل نہ تھے لیکن کردار کے غازی ضرور تھے اس پر اس کی پوری زندگی گواہ تھی اس لئے تو وہ لوگوں کے دلوں میں بستے تھے۔ بقول شاعر:

یہاں گفتار اور کردار میں لازم ہے یک رنگی
بشر کو چاہیے وہ اپنے قول وفعل کو تولے
نصیحت کی جگہ حسنِ عمل درکار ہے ناصح
یہ بہتر ہے کہ لفظوں کی بجائے زندگی بولے

مرحوم کی دوسری صفت بلکہ سب سے بڑی صفت جس نے ہر کسی کو متاثر کیا ہے وہ ان کی عاجزی اور خاکساری کی صفت تھی۔ اُن میں بلا کی عاجزی تھی اور غرور وتکبر سے وہ کوسوں دور تھے ان کی وضع قطع اور ظاہری سادگی دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ایک بڑے خاندان کے چشم و چراغ اور صاحبِ جائیداد خان ہیں۔ یہی وہ صفت ہے جو رب کائنات کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب صفت ہے اس لئے کہ بحوالہ حدیث قدسی ''اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ ''تکبر صرف اللہ تعالیٰ کے لائق شان ہے۔ بندۂ خاکی کو تکبر زیب نہیں دیتا بلکہ وہ اگر عاجزی اور خاکساری کا تحفہ اللہ تعالیٰ کے پاس لے کر جائے گا تو وہ اس سے خوش اور راضی ہوگا اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ زیادہ خوشی کسی کو اس تحفہ پانے پر ہوتی ہے جو اس کے پاس نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے پاس سب کچھ ہے لیکن عاجزی نہیں تو جو بندہ عاجزی لے کر اس کے پاس آئے گا اللہ تعالیٰ اس سے بڑا راضی اور خوش ہوگا۔ فارسی کے ایک شاعر نے اس مضمون کو خوب اچھی طرح نظم کیا ہے فرماتے ہیں:

چہار چیز آوردہ ام شاہا کہ در گنجِ تو نیست
عاجزی و بے کسی عذر و گناہ آوردہ ام

کہتا ہے اے بادشاہ! میں آپ کے پاس چار چیزیں لیکر حاضر ہوا ہوں جو تیرے خزانوں میں بھی نہیں۔ یہ پہلا مصرعہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بھلا کوئی چیز ایسی بھی ہوگی جو اللہ کے پاس اور اس کے خزانوں میں نہیں لیکن دوسرا مصرعہ پڑھ کر بات سمجھ میں آتی ہے کہ واقعی شاعر نے کمال کر دیا ہے کہتے ہیں کہ وہ چار چیزیں جو میں لے کر آیا ہوں وہ ہے''عاجزی، بے کسی، معذرت اور گناہیں''اور واقعتاً یہ چیزیں تو اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں ہوسکتیں۔

مرحوم کی ایک اور خوبی جسے ہم نے بہت سے علماء کی زبانی سنا اور خود بھی مشاہدہ کیا وہ ان کی علم دوستی تھی۔ ہمارے والد صاحب حکیم مولوی عبدالغفور مرحوم جو علاقے کی ایک بڑی علمی شخصیت جانے جاتے تھے ان کے مرحوم یار قند خان اور ان کے بڑے بھائی حاجی زر قند خان سے خاص قریبی مراسم تھے وہ فرماتے تھے کہ یہ دونوں علماء کے بڑے قدردان ہیں بلکہ ان کی نسبت سے وہ ہم ناچیزوں کی بھی بہت قدر کرتے تھے اور کبھی ملتے تو بڑے تپاک سے اور کھڑے ہوکر استقبال کرتے اور کہتے کہ یہ علماء کی اولاد ہیں تو ہمارے لئے قابلِ قدر ہیں کہ گوشت کا شوربہ بھی لذیذ ہوتا ہے یہ اُن کے الفاظ ہوتے تھے جو اکثر ملاقات کرتے ہوئے کہتے۔

الغرض مرحوم یار قند خان گوناگوں خوبیوں اور صفات کے مالک تھے۔ان کی ایک خوبی سے ہم ناواقف تھے اور وہ یہ کہ وہ لکھنے کا شوق بھی رکھتے تھے اور انہوں نے چند رفقاء کے کچھ خاکے بھی لکھے تھے جس کو برادرم ڈاکٹر شبیر احمد صاحب زیرِنظر کتاب میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم کتاب کی طباعت کا بے چینی سے منتظر ہیں تاکہ موصوف کی زندگی کے اس مخفی گوشے سے بھی لطف اندوز ہوسکے۔ دل بہت چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی لکھوں لیکن۔۔۔۔۔بس ان چند ٹوٹے پھوٹے بے ترتیب اور بے ربط حروف لکھنے پر اکتفا کرتے ہوئے اہل علم وبصیرت سے اِن میں موجود ہر قسم کی غلطیوں اور لغزشوں پر معافی چاہتا ہوں اور مضمون کو فارسی کے ان اشعار پر ختم کرتا ہوں۔

اند کے باتو بگفتم دِل غم ترسیدن
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیاراست

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

راقم الحروف بندۂ حقیر وناچیز
عبدالقدیرابن حکیم مولوی عبدالغفورمرحوم
ڈھیری لکپانی

تاثرات

علاقہ کاٹلنگ ایک مردم خیز خطہ رہا ہے اسی تاریخی خطہ میں ہر دور میں مثالی شخصیات گزری ہیں آج میں جس شخصیت کا ذکر زیب قرطاس کر رہا ہوں وہ ماضیٔ قریب میں علاقہ بائیزئی کاٹلنگ کے معروف سیاسی شخصیت تھے جومن کےفقیر تھے۔ ہرایک سے بہت عزت سے ملتے تھے۔ علماء کے قدردان تھے، ہم عصروں میں باوقار اور چھوٹوں سے شفقت کرنے والے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنا اُن کا شیوہ تھا۔ سادگی اور منکسرالمزاجی اس کی شناخت تھی۔ اعلیٰ درجہ کے سوشل ورکر اور سیاسی قدکاٹ کے مالک تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو مرحوم یارقند خان کے جاننے والے ہوں اور مذکورہ اوصاف کے معترف نہ ہوں۔ مجھے بچپن ہی سے ان کے گھر سے شناسائی ہے۔ وہ مجھ پر دو وجوہات سے شفقت کرتے تھے۔ ایک یہ کہ میرے والدصاحب ان کے مسجد کے پیش امام تھے اور دوسرا یہ کہ جناب ڈاکٹر شبیر احمد خان سے بچپن کی رفاقت تھی جب میں سن شعور کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ مرحوم یارقند خان ایک معزز خاندان کے فرد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ سیاسی بصیرت رکھنے والی شخصیت کے مالک ہیں لیکن یہ اعتراف اب بھی کرتا ہوں کہ مرحوم یارقند خان کے کردار میں کبھی تکبر اور انانیت کا اظہار نہیں دیکھا۔ یقیناً ان کی تربیت کا نتیجہ آپ اُن کے اکلوتے بیٹے جناب ڈاکٹر شبیر احمد خان کی سیرت وکردار میں دیکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیر احمد خان ایک صوفی مزاج شخصیت کے مالک ہیں۔ مجھ سے عقیدت رکھتے ہیں اسی خوش فہمی میں مجھ سے رابطہ کرکے بتایا کہ مرحوم جناب یارقند خان المعروف چیئرمین صاحب کی زندگی کے چند گوشے کتابی شکل میں چھاپنے کی کوشش کر رہے ہیں مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ مجھے مرحوم کے متعلق چند حروف لکھنے کی دعوت دی گئی ہے۔

جناب یارقند خان مرحوم جو اپنے علاقے اور گاؤں میں چیئرمین صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے تھے ایوب خان کے دور میں بی ڈی چیئرمین تھے۔ بعد میں یہ نام اُن کی شخصیت کا حصہ بن گیا اور تا دمِ زیست اکثر اس نام سے یاد کئے جاتے رہے۔ جناب یارقند خان مرحوم علماء کرام کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ میرے والد مرحوم جناب حافظ عبدالرحیم جو اسی محلے کے پیش امام وخطیب تھے اسی وجہ سے میرے والد مرحوم کے ساتھ چیئرمین صاحب کے اور بھی قریبی تعلقات تھے اور اسی وجہ سے راقم الحروف سے نیک گمان رکھنے کی وجہ سے کبھی کبھی دینی مسائل بھی دریافت کرتے تھے۔ یہ جناب یارقند خان کی علم دوستی کی ایک مثال ہے۔

ایک دفعہ قضاء نمازوں کے متعلق دریافت فرمایا کہ اگر کسی کی نمازیں قضاء ہوگئی ہو اور تعداد معلوم نہ ہو تو آدمی کو کیا کرنا چاہیے اور اس کی قضاء کی کیا صورت ہوگی؟ میں نے طریقہ سکھا دیا کہ آسان طریقہ یہ ہے کہ دن میں کم از کم پانچ نمازیں بمع وتر قضا کی نیت سے ادا کی جائیں۔ اگلے ملاقات میں جناب چیئرمین صاحب نے بتایا کہ میں نے قضاء نمازوں کی ادائیگی شروع کردی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ جناب یارقند خان کتنی توجہ سے دینی مسائل سنتے تھے اور اس پرعمل کی کوشش بھی کرتے تھے۔

ایک دفعہ مالی عبادت زکوٰۃ اورعشر کے متعلق دریافت کیا اور یہ پوچھا کہ اگر کسی شخص سے انجانے میں زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اس کا آسان حل کیا ہوسکتا ہے تو راقم الحروف نے بتایا کہ زیادہ سے زیادہ مالی انفاق یعنی اپنے حلال مال سے خرچ کرنا اس کا ایک آسان حل ہے اس سے اُن کی تشفی ہوگئی۔

مندرجہ بالا واقعات سے معلوم ہوا کہ جناب یارقند خان زندگی کے آخری دم تک دینی مسائل سمجھنے اور اُن پرعمل کی تڑپ دل میں رکھتے تھے۔ میں راقم الحروف حدیث مبارکہ کی روشنی میں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ مرحوم ایک سعادت مند انسان تھے جس کو اللہ نے نیک اولاد کی صورت میں ڈاکٹر شبیر احمد خان جیسا فرزند عطا فرمایا جس نے ماشاءاللہ اپنے

والد صاحب کے نام کو زندہ رکھا ہے اور نیک ہونے کی صورت میں اپنے والد محترم جناب یارقند خان مرحوم کے لئے صدقہ جاریہ ہیں۔

راقم الحروف

مولوی عرفان اللہ ولد حافظ عبدالرحیم (مرحوم)

حال بغدادہ مردان

خاکسار انسان

یارقند خان مرحوم اور ہمارے بزرگوں کے خاندانی مراسم اور تعلقات بہت پہلے سے قائم تھے۔لیکن 1977ء کے الیکشن میں جب مرحوم مسلم لیگ کے صوبائی اُمیدوار کے حیثیت سے نامزد ہوئے تو اُن کے ساتھ تعلق قائم ہوا اور اُن کے الیکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اسکے بعد اُن کے بہت قریب رہا اور مرتے دم تک تعلق قائم رہا۔یارقند خان مرحوم ایک بہت اچھے انسان تھے۔ہر وقت دوست احباب اُنکے گرد جمع ہوتے اور مزے مزے کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔اُنکے اخلاق کا کمال یہ تھا کہ کبھی بھی کوئی دوست اور ساتھی اُن سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا تھا۔اپنے بالاخانے میں صبح سے شام تک محفل جمائے رہتے۔ساولڈھیر سے بائیزوخرکئی تک تمام دوست واحباب کاٹلنگ آتے تو اُن کے ساتھ ملاقات ضرور کرتے۔تمام ساتھیوں کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ہر ایک کو یہ گمان ہوتا کہ سب سے زیادہ تعلق میرے ساتھ ہے۔اپنے حلقے کے حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھتے۔ہر غم وخوشی میں شریک ہوتے۔بہت ہی خاکسار اور ملنسار تھے۔کوئی بڑائی اور تکبر کی بات زندگی میں نہ اُن سے سنی اور نہ محسوس کی۔پارٹی کے اُمور میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔لیکن کسی عہدے کی لالچ نہیں ہوتی۔بلکہ جو عہدہ پیش کیا جاتا وہ کسی دوسرے ساتھی کو دے دیتے۔ایمانداری اور دیانتداری کا یہ عالم تھا کہ مخالفین بھی کوئی الزام نہیں لگا سکتے تھے۔آخری ملاقات میں مجھے وصیت کی کہ میں تمام جاننے والوں کو اپنی طرف سے معاف کرتا ہوں اور جو بھی ساتھی ملے اُس سے میرے لیے معافی مانگیں۔رقم کے لین دین کے بارے میں نہیں کیونکہ میں نے ساری عمر کسی کا کوئی حق نہیں کھایا ہے۔البتہ اگر گپ شپ یا کسی اور بات سے کسی کی دل آزاری کی ہو تو اُس سے معافی کا طلب گار ہوں۔

یارقند خان جیسے عظیم اور بلند پایۂ اخلاق کے مالک مدتوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔مرحوم کی

زندگی اور کردار پرتو ہر ساتھی ایک کتاب لکھ سکتا ہے لیکن اپنی طرف سے اور اپنے دوست احباب کی طرف سے اس چھوٹی سی تحریر پر اکتفا کرتا ہوں۔ اور آخر میں مرحوم کیلئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُنکو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور جنت الفردوس نصیب فرمائیں اور اُسکے بیٹے ڈاکٹر شبیر احمد خان اور تمام پسماندگان کو وہی برکت اور عزت عطا فرمائیں جو مرحوم کو حاصل تھی۔ آمین ثم آمین

قیمت گل آف ساولڈھیر

......☆......

ماموں جان کی کچھ یادیں

ہمارے بزرگوں اور اسلاف میں ایسی شخصیات گزری ہیں کہ اس جہان فانی سے چلے جانے کے بعد بھی اُن کی خدمات، خلوص اور جذبۂ ایثار کو آج بھی خراج تحسین پیش کی جا رہی ہے۔ ان حضرات میں ایک شخصیت اللہ بخشے میرے ماموں جان جناب حاجی یارقند خان کی تھی۔

ماموں جان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا۔ وہ انتہائی ملنسار، خاکسار، تواضع کرنے والے اور غریب دوست شخص تھے۔ اُن کا سیاست سے گہرا تعلق رہا اور سیاسی پس منظر کی بنیاد پر وہ دور دور تک پہچانے جاتے تھے۔ ایوبی دور میں B.D الیکشن میں یونین کونسل کاٹلنگ کے پہلے چیئرمین منتخب ہوئے اور اسی وجہ سے بعد میں بھی چیئرمین صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے۔ پاکستان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے کئی الیکشن بھی لڑے۔ مگر اللہ کو الیکشن میں اُن کی کامیابی منظور نہ تھی۔ اس کے علاوہ انہیں اللہ نے دنیاوی نعمتوں سے خوب نوازا تھا۔

مرحوم چیئرمین صاحب ہمارے مرحوم والد مومن خان آف شاہ ڈنڈ سے خصوصی محبت کرتے تھے۔ والد مرحوم کے ملفوظات میں مرحوم یارقند خان کی کچھ یاداشتیں محفوظ ہیں جو کہ قارئین کے لئے پیش خدمت ہیں۔

چیئرمین صاحب ایک دفعہ کسی اصولی بات پر دل برداشتہ ہو کر گھر سے کچھ دنوں کے لئے دوستوں کے ہاں کراچی چلے گئے۔ اُن کی گاؤں سے دوری پر والد محترم بہت پریشان رہتے تھے۔ آخر کار خط و کتابت شروع ہوئی۔ کراچی سے ایک خط مومن خان کے نام مجھے ملا۔ اس خط کا ایک اقتباس مجھے یاد ہے جس میں ماموں جان ایک خوبصورت مثال دیتے ہیں لکھتے ہیں کہ: خان صاحب گھر کا ایک فرد گھر والوں کو خبردار کرتا ہے کہ میرے جسم پر فلاں جگہ سرخی

مائل پھوڑا نکل آیا ہے۔ گھر والوں نے یہ بات نظرانداز کی۔ بتدریج یہ سرخی مائل پھوڑا بڑا ہوتا رہا گھر کا فرد ہر بار گھر والوں کو خبردار کرتا رہا مگر گھر والے ہر دفعہ سنی ان سنی کر دیتے۔ مذکورہ شخص نے گھر والوں کے علاوہ یار دوستوں، اقرباء اور ہمدردوں کو بھی مطلع کیا مگر کسی نے کوئی اہمیت نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ مرض ایک خطرناک شکل اختیار کر گیا۔ اب سب گھر والوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی مریض کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگئی۔ حالانکہ سب کو اس صورتحال کی پیش بندی کرنی چاہیے تھی۔ مرحوم یارقند خان کا یہ اقتباس اُن کے دوراندیشی اور باریک بینی پر دلالت کرتا ہے کہ ہر وہ چیز جو بعد میں ناسور کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اِبتداء سے اُس کا سدِ باب کیا جائے۔

ماموں جان کی سیرچشمی اور ایثار کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ جب جائیداد کی خانگی تقسیم کا موقع آیا تو انہوں نے اپنے بڑے بھائی ملک صنوبر خان آف گُنج کا سامنا تک نہیں کیا بلکہ کاغذ پر بڑے بھائی کو لکھ کر بھیجا کہ بھائی صاحب جو جائیداد آپ کو پسند ہو آپ لے لیں اور جو ناپسند ہو وہ میرے لئے چھوڑ دیں۔

موصوف کی ایک بڑی صفت یہ بھی تھی کہ وہ حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ علی الصبح گھر سے عوام کی خدمت کے لئے نکلتے اور رات کو تشریف لاتے۔ کبھی بھی اپنے ساتھ حفاظت کے لئے گارڈ نہیں رکھے۔ میرے والد مرحوم مومن خان ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر یارقند خان کے بارے میں فکرمند رہتے تھے اور انہیں اپنی حفاظت کے لئے اپنا ذاتی ریوالور دے دیا۔ انہوں نے مومن خان کا دل رکھنے کے لئے ریوالور تو لے لیا لیکن مرتے دم تک کسی نے بھی اُن کے ساتھ ریوالور (پستول) نہیں دیکھا۔ شاید لیتے ہی کسی بکس میں پھینک دیا ہوگا۔ یہ اُن کا اللہ پر مضبوط ایمان اور توکل کا ایک نمونہ تھا۔

ماموں جان یارقند خان مرحوم حد درجہ مہمان نواز تھے۔ مولانا شمس التبریز فرماتے ہیں کہ ’’ مکہ شریف میں حج کے لئے ہم ایک گروپ کی شکل میں گئے تھے۔ اُسی سال یارقند خان

مرحوم بھی آئے تھے۔ایک موقع پر ہماری اُن سے ملاقات ہوئی۔ یارقند خان نے ہمیں کھانے کی دعوت دی تو ہم نے کہہ دیا کہ ہم بیت اللہ شریف حج کے لئے آئے ہیں ہم اللہ کے مہمان ہیں ہم آپ کے مہمان نہیں بن سکتے۔مہمان نواز یارقند خان نے مسکراتے ہوئے کہہ دیا۔کہ کیا آپ لوگوں کو یہ پسند نہیں کہ اللہ کے مہمانوں کو میں اپنا مہمان بناؤں۔اور پھر ہم اُن کے مہمان بن گئے۔''

اگر چہ ماموں جان مرحوم اب اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں لیکن اُن کی فیاضی اور مہمان دوستی کو اب تک یاد کیا جاتا ہے۔چونکہ ماموں جان اپنی طالب علمی کے زمانے میں دو سال ہمارے گھر شاہ ڈنڈ میں رہے اس لئے اُنہیں ہمارے سارے خاندان بلکہ شاہ ڈنڈ کے اور لوگوں سے بھی خصوصی محبت تھی اور وہ اکثر وہاں آتے تھے۔وہ میری والدہ اور میری پھوپھی جو ''الیے بی بی'' کے نام سے مشہور تھی سے بہت محبت کرتے تھے اور اُن کی اتنی عزت کرتے تھے کہ نہ اُن کے سامنے اونچی آواز سے باتیں کرتے تھے اور نہ اُن کے سامنے سگریٹ پیتے تھے حالانکہ سگریٹ پینا اُن کا معمول تھا۔ہماری پھوپھی ''الیے بی بی'' کو ماموں جان سے اتنی محبت تھی کہ اپنے آخری وقت تک اُن کو اور ہمارے والد مومن خان کو یاد کرتی رہی۔

عطاءاللہ ولد مومن خان

ساکن شاہ ڈنڈ لوند خوڑ

......☆......

داجی کی کچھ یادیں، کچھ باتیں

میں نے پہلی دفعہ یارقند خان کو اُس وقت دیکھا تھا جب میں چوتھی کلاس میں تھا اور اپنے والد کے ساتھ کاٹلنگ میں مسلم لیگ کے جلسے میں گیا ہوا تھا جس میں مشہور مسلم لیگی رہنما خان عبدالقیوم خان آئے ہوئے تھے۔ انہیں دوسری بار دیکھنے اور اُن سے باقاعدہ ملاقات کا موقع اُس وقت ملا جب میں میڈیکل کالج میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ یہ ملاقات جمال گڑھی میں ایک تقریب میں میرے والد صاحب نے کرائی اور کہا کہ خان صاحب کا بیٹا شبیر احمد خان بھی میڈیکل کالج میں داخل ہوا ہے اور اُن سے ضرور ملنا ہے۔ وہ میری والدہ کی طرف سے ہمارے رشتہ دار تھے اور میری امی انہیں ماموں کہہ کر پکارتی تھی۔

اُن نے تیسری دفعہ جب میری ملاقات ہوئی تو اُس وقت میں اُن کا داماد بن چکا تھا۔ اس کے بعد اُن سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو اُن کی وفات تک جاری رہا اور مجھے انہیں قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ یارقند خان (جن کو اُس کے گھر والے اور میں ''داجی'' کہہ کر پکارتے تھے) نے مجھے داماد سے زیادہ ایک دوست کی حیثیت دی اور مجھے اپنے انتہائی قریب رکھا۔ باہر کے لوگوں اور اپنے رشتہ داروں میں وہ ایک سنجیدہ اور ایک نسبتاً سخت مزاج رکھنے والے کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ اُن کا رویہ بالکل مختلف تھا اور اُن کے ساتھ وہ اکثر گپ شپ اور طنز و مزاح کے موڈ میں ہوتے۔

داجی کاٹلنگ اڈہ میں اپنے بالا خانے میں بیٹھتے تھے جو مارکیٹ کے اوپر حجرے کی طرز کی جگہ تھی جو بہت ہوادار تھی اور اونچائی پر ہونے کی وجہ سے وہاں سے اردگرد کا منظر بہت خوبصورت نظر آتا وہاں پر ہر وقت اُن کے دوستوں کا مجمع لگا رہتا۔ اُن کے دوستوں میں مختلف

مزاح، عمر اور پس منظر کے لوگ موجود تھے لیکن وہاں پر سب کی یکساں عزت کی جاتی تھی۔ وہاں پر ہر وقت ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی تھیں اور دوست ایک دوسرے کو مختلف طریقوں سے چھیڑنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے تھے اور کسی کو زیادہ دیر کے لیے خفہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں ہر اتوار کو کاٹلنگ آتا تھا اور اُن کے ساتھ گپ شپ لگاتا تھا۔ بعد میں میرے سعودی عرب جانے سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا لیکن مجھے اُس جگہ سے اتنی اُنسیت پیدا ہوگئی ہے کہ میں جب بھی سعودی عرب سے آتا ہوں تو وہاں کا چکر ضرور لگاتا ہوں۔

داجی کے ساتھ اچھے تعلقات کے لیے یہ ضروری تھا کہ آپ اُن کے مزاج سے واقف ہوں۔ ایسے لوگ جو اُن کے مزاج کے خلاف ہوتے یا بوریئت کا باعث بنتے اُن کو وہ بہت اچھے طریقے سے چائے پلا کر یہ کہہ کر جلدی رخصت کر دیتے کہ لگتا ہے آپ جلدی میں ہیں اور بس یا فلائنگ کوچ بھی جانے کے لیے تیار ہے۔ ڈاکٹر شبیر کی شادی پر اُن کے ایک دوست بہت لیٹ تقریباً شام کے وقت پہنچے۔ داجی کو اُن کا اس وقت آنا ناگوار گزرا۔ اُن کو کھانا کھلانے کے بعد اُن سے کہا کہ اگر رات گزارنی ہے تو سارے انتظامات موجود ہیں لیکن اگر واپس جانا ہے تو جلدی کریں کیونکہ یہاں کے راستے خطرناک ہیں۔ یہ سُن کر اُس مہمان نے جلدی سے اجازت لی اور پشاور روانہ ہو گئے۔

اُن کی محفلوں میں دوست مختلف طریقوں سے ایک دوسرے کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے ایک گمنام خط لکھ کر داجی سمیت سب پر طنز کے تیر برسائے۔ اُس پر تحقیقات شروع ہوئی کہ یہ کس کی کارستانی ہے اور زیادہ تر ساتھیوں کا خیال تھا کہ بخت بلند خان اس میں ملوث ہیں۔ ڈاکٹر اجمل صاحب ہر وقت مذاق کے موڈ میں ہوتے تھے اور کبھی کبھی مجھے بالا خانے کے اطوار بھی سمجھاتے تھے مثلاً یہ کہ داجی سے کبھی ماچس نہ مانگنا جس کی تیلی کو میں کھانا کھانے کے بعد دانت صاف کرنے کے لیے کبھی کبھی استعمال کرتا تھا۔ جب میں کسی مہمان

سے ڈاکٹر اجمل کا تعارف کراتا کہ ڈاکٹر صاحب ایک اچھے شاعر ہیں اور اُن کا غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے تو سارے ساتھی اس پر ہنسنے لگتے تھے۔ میں اکثر اجمل صاحب سے اپنا کلام سنانے کے لیے کہتا۔ جب وہ اپنا کلام سنانے لگتے تو باقی لوگ اُس کو ہوٹنگ (Hooting) کا نشانہ بناتے۔ داجی کو بھی بعض مخصوص شاعروں کے علاوہ باقی شاعروں کے کلام سے کوفت ہوتی تھی۔

جب میں نے سپیشلا ئیزیشن (Specialization) کا امتحان پاس کیا تو داجی کے دوستوں کے لیے دعوت کا اعلان کیا۔ وہ دعوت کسی وجہ سے لیٹ ہوگئی۔ اس پر میں نے کہا کہ میں فقیر گل خان کو پیسے دے دیتا ہوں تا کہ وہ دعوت کا اہتمام کرے کیونکہ وہ انتظامات کرنے اور پیسے خرچ کرنے کے معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ اس پر داجی نے برجستہ کہا ''فقیر گل خان کیا انتظام کریں گے وہ تو خود بینک ڈیفالٹر ہیں''۔ اگلے ہفتے فقیر گل خان نے ایک بہترین دعوت کا انتظام کیا جس میں میرے حق میں بہت سی تقریریں بھی ہوئیں اور یوں وہ تقریب ایک یادگار واقعہ میں بدل گئی۔

ڈاکٹر محمد ارشاد خان

ای این ٹی کنسلٹنٹ ریاض سعودی عرب

......☆......

میرے والد

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کرگیا

میرے والد صاحب بہت پیار کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے ہمیں باپ کا پیار بھی دیا اور ماں کا بھی۔ انہوں نے ہماری بہت اچھی تربیت کی اور ہمیشہ ہمیں راحت اور سکھ پہنچانے کے لیے سرگرداں رہے۔

اُن کی ساری زندگی دوسروں کی خدمت میں گزری۔ انہوں نے اپنے بچوں، بھائیوں، بہنوں، رشتہ داروں، دوستوں اور عام لوگوں سب کی خدمت کی لیکن کسی سے بھی صلے کی توقع نہ کی۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے اور اپنی بیٹیوں سے بھی یہ طمع نہیں رکھی کہ وہ اُن کی خدمت کریں یا اُن کی مدد کریں۔ وہ اپنا ہر کام خود کرنے کے عادی تھے اور کسی کو بھی تکلیف دینے سے گریز کرتے تھے۔ وہ ہماری خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے لیکن ہم سے کسی چیز کا تقاضا کرنے سے حتی الوسع احتراز کرتے تھے۔ لگتا ہے کہ کسی سے خدمت لینا یا کسی کے زیر احسان ہونا اُن کی طبیعت پر گراں گزرتا تھا۔

اُن میں خاکساری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کو ہمیشہ پہلے سلام کرتے تھے اور اس میں امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ یہاں تک وہ اپنے مخالفین کو بھی سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا اور قدرت رکھنے کے باوجود ہمیشہ صلح جوئی اور مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنایا۔

جب میری شادی ہوئی تو ایک دفعہ میں سسرال سے میکے آئی۔ والد صاحب گھر پر موجود تھے۔فوراً چارپائی سے اُٹھے۔ مجھے گلے لگایا اور میرا ماتھا چوما۔ مجھے چارپائی پر بٹھایا اور خود اندر جا کر میرے لیے تکیہ لا کر کہا کہ مجھے بیمار لگ رہی ہو، لیٹ جاؤ۔اس کے بعد دیر تک وہ میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے رہے اور مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اُن کے اس والہانہ پیار کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔

والد صاحب اس وقت اس دُنیا میں نہیں مگر وہ ہمارے اور اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور اُن کی یادیں ہمارا سرمایہ ہیں۔ اُن کی وفات کو دس سال کا عرصہ گزرا ہے لیکن ہمیں اس طرح لگتا ہے جیسے وہ کل فوت ہوئے ہوں۔

وہ اپنی بیٹوں اور اُن کی اولاد سے بہت پیار کرتے تھے۔ہمیں معمولی تکلیف ہوتی تھی تو وہ بے چین ہو جاتے تھے۔ انہوں نے ہمیں سیکھایا کہ ہر کسی کی عزت کریں اور کسی سے نفرت نہ کریں۔ وہ بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے علاقہ کے خان ہونے کے باوجود اُن کی طرزِ زندگی ایک عام آدمی کی طرح تھی۔ وہ دوسروں پر خرچ کرنے میں کھلے دل کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن خود اپنے اوپر خرچ کرنے میں محتاط رہتے تھے۔

وہ بہت ذہین اور قابل انسان تھے مگر کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ مجھے پڑھائی میں کوئی مشکل پیش آتی تو اُن سے مدد لیتی۔ میں سکول اور کالج کے زمانے میں ایک اچھی مقررہ (Debator) تھی۔ والد صاحب ہر وقت میرا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے اور میری کامیابیوں پر بہت خوش ہوتے۔ جب میں نے ایک دفعہ جہلم صوبہ پنجاب میں منعقدہ آل پاکستان تقریری مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا تو اُس دن اُن کی خوشی دیدنی تھی۔ میں ہمیشہ تقریر لکھتے وقت اُس سے مشورہ کرتی تھی اور وہ مجھے انتہائی مفید تجاویز دیتے تھے۔

وہ اپنی بہنوں سے بہت پیار کرتے تھے اور اُن کی خدمت کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ اُن کی بہنوں کو بھی اُن سے بہت زیادہ محبت تھی اور وہ ہمیشہ والد صاحب کے

بارے میں فکرمند رہتی تھیں۔ انہوں نے اپنی والدہ کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور وہ ساری عمر والد صاحب کے ساتھ مقیم رہیں۔ یہ انہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ والد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں بہت عزت اور دولت سے نوازا اور اُن کو نیک اولاد عطا کی جو اُن کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

وہ ہماری سب سے چھوٹی بہن جو ڈاکٹر ارشاد کی زوجہ ہیں اور اُس وقت سعودی عرب میں مقیم ہیں سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ امتحان میں اُس کے نمبر کم آئے لیکن والد صاحب مسلسل اُن کا حوصلہ بڑھاتے رہے اور کہتے رہے تم (Very good third division) میں پاس ہوئی ہو۔ ہماری چھوٹی بہن اب بھی اُنہیں یاد کر کے روتی رہتی ہیں۔ ہم انہیں دلاسہ دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ ابھی تک اپنے شفیق والد کی جدائی پر مغموم رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

عذرا بیگم
دخترِ یارقند خان

......☆......

میرے محسن

میں جب آج سے تقریباً پینتیس سال پہلے روزگار کے سلسلے میں کاٹلنگ پہنچا۔ تو محمد شیر خان جمال گڑھی نے مجھے کہا تھا کہ کاٹلنگ جا کر یارقند خان سے ملنا۔ میں نے کاٹلنگ پہنچ کر یارقند خان کے بارے میں معلوم کیا تو مجھے کچھ لوگوں نے اُن کے بالاخانے کے بارے میں بتایا۔ میں وہاں اُن سے ملا اور انہیں اپنی روداد سنائی۔ انہوں نے بہت عزت کی اور دلبر خان کو ساتھ کر کے حاجی آدم خان مرحوم کے پاس بھیجا کہ اُنہیں کہو کہ یارقند خان کا مہمان ہے۔ اسی طرح میں نے کاٹلنگ میں چیئر مین صاحب کے توسط سے اپنا کاروبار شروع کیا۔

چیئر مین صاحب مجھے اپنے چھوٹوں کی طرح پیار کرتے تھے اور ان کی مہربانی سے میرا کاروبار چلتا رہا۔ انہوں نے مجھے ہر موڑ پر حوصلہ دیا اور میری ہر طرح کی رہنمائی کی۔ مجھے ہر پروگرام میں شامل کرتے تھے اور ان کے تمام دوستوں سے میری شناسائی رہی۔ جلد ہی اُن کے دوستوں میں گھل مل گیا اور مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ میں اپنے گاؤں میں نہیں ہوں یا کسی اور کے گاؤں میں ہوں۔ ایک وقت آیا جب بعض دوست چیئر مین صاحب سے ناراض ہوئے اور مجھے بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اُن حالات میں بھی یارقند خان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بعد میں یارقند خان کی بصیرت سے جلد یہ مسئلہ حل ہوا اور سارے دوست پہلے کی طرح شیر وشکر ہو گئے۔ میں ہمیشہ اُن کو اپنی دُعاؤں کا حصہ سمجھتا ہوں اور اپنی ہر دعا چیئر مین صاحب کے ذکر کے بغیر ادھوری تصور کرتا ہوں۔

گل محمد خان
کالو خان حال کاٹلنگ

بہترین دوست

میری یار قند خان کے ساتھ ایک طویل رفاقت رہی اور یہ تعلق اُن کی وفات تک قائم رہا۔ اُن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دوست بناتے بھی تھے اور دوستی نبھاتے بھی تھے۔ وہ ہمیں بہت عزت دیا کرتے تھے اور ہم بھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ علاقہ کی جانی پہچانی شخصیت تھے اور ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ہم اُن سے اپنے تعلق پر فخر کرتے تھے۔

چیئر مین صاحب اکثر ہمارے گاؤں ہم سے ملنے آتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کے جمال گڑھی میں دوستوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا یہاں پر اُن کے قریبی دوستوں میں سلیم اختر مرحوم، گل سید شاہ، فضل رحمان عرف ککے، محمد دین اور صنوبر عرف جرنیل شامل تھے وہ ہمارے پورے گاؤں میں ہر دلعزیز تھے۔

ہماری مغلکو نوشہرہ میں رشتہ داری کی وجہ سے اکثر وہاں آنا جانا رہتا تھا۔ وہاں پر چیئر مین صاحب کی شناسائی ہمارے ایک دوست غنی سرور سے ہوئی جو بعد میں دوستی میں تبدیل ہوئی۔ غنی سرور کراچی میں نوکری کے سلسلے میں مقیم تھے ایک دفعہ چیئر مین صاحب جوانی میں گھر سے خفہ ہو کر کراچی چلے گئے۔ اُن کی والدہ کو اُن کی بہت فکر لاحق تھی وہ ہمارے گھر آئی اور مجھے کہا کہ تم ہی اُن کو واپس گھر لا سکتے ہو اور میں اُن کو لانے کراچی روانہ ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ غنی سرور کے ساتھ تھے اور خوب مزے میں تھے۔ غنی سرور کے دوست باری باری اُن کی دعوت کر رہے تھے۔ میں نے بھی وہاں پر چند دن گزارے اور پھر انہیں لے کر واپس آ گیا۔

چیئر مین صاحب اپنی آخری ملاقاتوں میں ہم سے کہتے تھے کہ میرے بعد میرے بیٹے

ڈاکٹر شبیر کے ساتھ تعلق نہیں چھوڑنا ہے اور اُن کا خیال رکھنا ہے۔ اُن کی وفات کے بعد ڈاکٹر شبیر صاحب ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں اور ہمارے ساتھ مسلسل رابطے میں بھی رہتے ہیں۔

شمس الدین خان
جمال گڑھی

مرحوم گل سید شاہ کے تاثرات

جب ہم اس کتاب کے سلسلے میں والد صاحب کے دوستوں کے تاثرات جمع کر رہے تھے تو ہم نے ان کے دیرینہ دوست گل سید شاہ آف جمال گڑھی سے رابطہ کیا وہ بذاتِ خود تشریف لائے اور ہم نے اُن سے اُن کے تاثرات لکھنے کی درخواست کی وہ بہت خوش ہوئے اور وعدہ کیا کہ اگلے اتوار کو وہ اپنے خیالات قلم بند کر کے ہمیں دے دیں گے۔ اس دوران انہوں نے والد صاحب سے اپنی دوستی کے آغاز کا ذکر کیا کہ اُن کی شناسائی والد صاحب سے اُن دنوں ہوئی جب وہ گورنمنٹ ہائی سکول کاٹلنگ میں پڑھتے تھے اور والد صاحب وہاں پر اُستاد کی حیثیت سے پڑھاتے تھے یہ شناسائی بعد میں دوستی میں بدل گئی جو والد صاحب کی وفات تک قائم رہی۔

گل سید شاہ اپنی نوکری کے دوران ملک کے مختلف شہروں میں مقیم رہے لیکن اُن کا والد صاحب سے رابطہ برقرار رہا مجھے والد صاحب کے کاغذات میں گل سید شاہ کے چند خطوط ملے تھے جو میں نے بعد میں اُن کو دے دیئے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ اُن کے پاس بھی والد صاحب کے لکھے ہوئے چند خطوط موجود ہیں۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ خطوط اگر مجھے مل جائیں تو اس کتاب میں چھاپ دیں گے انہوں نے افسوس سے کہا کہ وہ خطوط گھر تبدیل کرنے کے دوران کہیں گم ہو گئے ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے والد صاحب سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اپنی آخری دنوں میں والد صاحب نے انہیں اور سلیم اختر کو بلایا اور دونوں سے کہا کہ تم دونوں مجھے دین کی طرف بلاتے تھے اور نیک عمل کی تلقین کرتے تھے لیکن اس وقت مجھ پر وہ باتیں زیادہ اثر نہیں کرتی تھیں۔ اب جب کہ مجھے ایسا

لگ رہا ہے کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔گل سید شاہ کا کہنا تھا کہ انہوں نے والد صاحب کو دلاسہ دیا اور کہا کہ آپ نے تو ساری زندگی اللہ کے مخلوق کی خدمت میں گزاری ہے اور حقوق اللہ کے سلسلے میں بھی توبہ کا دروازہ انسان کی آخری سانس تک کھلا رہتا ہے۔

اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے والد صاحب کا گل سید شاہ اور سلیم اختر کو بلانا اور ان سے رہنمائی حاصل کرنا ان دونوں کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات کا ایک مظہر تھا گل سید شاہ کا معمول تھا کہ وہ جب بھی کاٹلنگ آتے تو اپنے دیرینہ دوست کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے ضرور حاضر ہوتے اور کافی دیر تک وہاں پر موجود رہتے۔گل سید شاہ سے ہماری آخری ملاقات آٹھ جنوری ۲۰۱۷ء کو اتوار کے دن میرے کلینک میں ہوئی۔ جانے سے پہلے انہوں نے اپنی بلڈ پریشر کی بیماری کا بتایا جب میں نے اُن کا بلڈ پریشر چیک کیا تو وہ بہت زیادہ تھا پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ کچھ عرصہ دوائیاں لیتے رہے لیکن بعد میں لینا چھوڑ دیں۔ میں نے انہیں دوائیاں جاری رکھنے کی تاکید کی۔انہوں نے اپنے چیک اپ کے لئے پشاور آنے کی خواہش ظاہر کی ۔ میں نے اُنہیں کہا کہ وہ جب چاہیں وہاں آجائیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اُن کے پاس میرا موبائل نمبر موجود ہے اور وہ پشاور آنے سے ایک دن پہلے مجھے اطلاع دے دیں گے۔

اگلی اتوار کو ہم ان کی تحریر کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہیں آئے ہم نے سوچا کہ کوئی ضروری کام پیش آگیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ نہیں آسکے میں پشاور چلا گیا اور دل میں سوچا کہ اگلے اتوار کو اُن سے وہ تحریر لے لوں گا اور چیک اپ کے لئے آنے کی یاددہانی بھی کرادوں گا میں جب سولہ جنوری ۲۰۱۷ء کو بدھ کے روز صبح اُٹھا تو میرے موبائل پر اُن کے بیٹے کا پیغام آیا تھا کہ اُن کے والد گل سید شاہ وفات پا چکے ہیں۔میں حیرت سے دنگ رہ گیا بعد میں اُن کے بیٹے سے ذکر کیا کہ اُن کے والد صاحب نے علاج کے لئے پشاور

آنے کا کہا تھا تو انہوں نے بتایا کہ اُس دن صبح اُن کا میرے پاس آنے کا ارادہ تھا لیکن رات کو اُن پر دل کا دورہ پڑا اور اُن کا انتقال ہو گیا۔ میرے خیال میں والد صاحب عالم برزخ میں اُنہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اور ہم سب کی مغفرت فرمائیں۔ آمین۔

ڈاکٹر شبیر احمد خان

مرحوم یارقند خان، ایک ہمہ جہت شخصیت

یہ آج سے تقریباً ۴۰ برس پہلے کی بات ہے اپنے ننھیال میں پرائمری تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے میں اپنے آبائی گاؤں کاٹلنگ منتقل ہوا اور گورنمنٹ سکول کاٹلنگ میں داخلہ لیا۔ اپنے کلاس میں ایک ہونہار اور ملنسار لڑکے سے شناسائی پیدا ہوئی جو رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ ابھی بلوغت تک نہیں پہنچے تھے، لاپرواہی کے دن تھے۔ سکول سے چھٹی کے بعد اور ناغہ کے روز اکثر اس کی دعوت پر میں اس کے ہاں جاتا، وہاں ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھتے اور وقفے کے دوران ان کے حجرے میں کرکٹ کھیل کر دل بہلاتے۔ یہ لڑکا پیارا بھائی اور آج کا ڈاکٹر شبیر احمد خان ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی والدہ محترمہ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، انتہائی باوقار خاتون اور شفیق انسان تھیں۔ وہ لوند خوڑ کے ایک بڑے خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے دوستوں کا خیال رکھتیں۔ ہم شرارتیں کرتے، کبھی کوئی چیز بھی توڑ دیتے مگر انہوں نے کبھی ڈانٹا نہ برا منایا۔ وقار اور تمکنت کا نمونہ بنی بس اپنے کام میں مصروف رہتیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

میں چونکہ کئی سال باہر گزار کر گاؤں میں نیا نیا آیا تھا اس لئے بہت کم لوگوں کو پہچانتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد سے ابھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک دن ہم عصر کے وقت حجرے میں ٹینس کے ریکٹ اور ٹینس بال سے کرکٹ کھیل رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر سے میانہ قد کاٹھ اور تقریباً ۵۰ سال کی عمر والے ایک نفیس انسان برآمد ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت بیٹنگ کر رہے تھے، وہ رکے اور کہا السلام علیکم۔ صاف و شفاف کپڑے میں ملبوس اور تازہ شیو کئے

ہوئے اس بزرگ نے وعلیکم السلام کہا، رک گئے، میری طرف دیکھا، میں نے انہیں سلام کیا تو مجھے پاس بلایا، میں ان کے قریب گیا تو انہوں نے میرا ہاتھ اپنے نرم وگداز ہاتھوں میں پکڑا اور پوچھا کس کے بیٹے ہو؟ میں نے بتایا تو میرے والدمحترم اور تب زندہ اور اب مرحوم چچا جان کا حال احوال پوچھا اور کہا کہ تمہارے یہاں آنے پر بڑی خوشی ہوئی، اپنے کلاس فیلو کے پاس اسی طرح آتے رہا کرو۔ پھر میرے والدمحترم اور چچا جان کا نام لے کر کہا ان کو میرا سلام پہنچانا۔ یہ مرحوم یارقند خان کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد اگلے دو تین سال تک اسی طرح مرحوم کے ساتھ آمنا سامنا ہوتا، وہ اپنے مخصوص انداز میں سلام کرتے، کبھی کبھی رُک کر سکول اور سبق کا حال احوال پوچھتے اور پھر چلے جاتے۔ اس کے بعد مرحوم کے ساتھ شاذونادر ہی ملاقات ہو پاتی۔ کبھی راستے میں ملتے تو کبھی گاؤں کے حجروں میں فاتحہ خوانی کے موقع پر آمنا سامنا ہو جاتا یا کبھی بازار میں اپنی ملکیتی مارکیٹ کے چھت پر واقع اپنے دفتر میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے نظر آجاتے۔

ان کے قابل، ہمدرد اور حساس برخوردار ڈاکٹر شبیر نے چند روز پہلے جب یہ بتایا کہ وہ اپنے مرحوم باپ پر کتاب چھاپنا چاہتے ہیں جس میں اس فقیر کو بھی ان کی شخصیت اور کردار پر اپنے تاثرات قلمبند کرنے ہیں تو بڑی خوشی ہوئی۔ آج اپنے مشاہدات، تجربات اور علم کی روشنی میں اپنے کچھ تاثرات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

مرحوم یارقند خان کی شخصیت اور کردار کا جو خاکہ میرے دل و دماغ میں موجود ہے آیئے اس کے چند نمایاں خدوخال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ نفاست پسندی:

ان کی شخصیت کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے نفاست پسند تھے۔ ہمیشہ صاف ستھرا اور اُجلا لباس زیب تن کرتے تھے، اُنہیں جب بھی دیکھا ان کی شیو ایسی لگتی جیسے ابھی ابھی

کی گئی ہو۔ کبھی انہیں اس حال میں نہیں دیکھا کہ ان کی شیو بڑھی ہوئی ہو یا ان کے کپڑے اور مخصوص پشاوری چپل نکھری اور صاف نہ ہوں۔ بعد میں انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔

۲۔ درمیانی چال:

ان کی چال نہ تیز تھی نہ بہت آہستہ، وہ ایک خاص دھیمی اور درمیانی رفتار کے ساتھ چلتے تھے۔ کبھی ان کو تیز قدم اُٹھاتے نہیں دیکھا۔ ان کی چال وقار و تمکنت کا نمونہ اور ان کے مزاج کے ٹھہراؤ کا مظہر تھی۔

۳۔ عاجزی وانکساری:

ان کی شخصیت اور کردار کی نمایاں ترین خصوصیات ان کی عاجزی وانکساری تھی۔ غرور و تکبر کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ خاکسار انسان تھے، سب کی عزت کرتے تھے۔ سلام میں پہل ان کی ایک خاص صفت تھی۔ غریب ہوتا یا امیر، جوان ہوتا یا بوڑھا، شناسا ہوتا یا انجان، سب کو وہ پہلے سلام کرتے۔ اُنہیں کبھی کوئی سلام کرنے میں سبقت لے جائے ایسا ہونا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

۴۔ سلام کا مخصوص انداز:

سلام کرنے کا ان کا ایک خاص دلکش انداز تھا، کسی کا سامنا ہوتا اور قریب آتے تو ذرا سا رک کر آگے کو جھک جاتے، اپنا داہنا ہاتھ اپنے داہنی آنکھ کے اوپر ماتھے پر رکھ دیتے اور بندے کو دیکھتے ہوئے بلند آواز سے السلام علیکم کہتے۔ جواب ملتا تو ہاتھ اُسی طرح ماتھے پر رکھے اور ہتھیلی کی پشت کو سامنے کرتے ہوئے تھوڑا سا مزید جھکتے اور مہربانی مہربانی کہتے اور حال احوال پوچھتے ہوئے آگے بڑھتے۔ یہ سب کے لئے ان کا معمول تھا۔

۵۔ خوش اخلاقی:

وہ اعلیٰ اخلاق کا مجسم نمونہ تھے۔ زندگی بھر نہ دیکھا نہ کسی سے سنا کہ انہوں نے کسی سے جھگڑا کیا، کسی پر غصہ اُتارا، کسی کی توہین کی، کسی کی حق تلفی کی ہو۔ ہمیشہ انہیں سب سے محبت و

احترام کا سکون کرتے دیکھا۔ خاکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی وجہ سے شاید ہی کسی کا دل دکھا ہو۔

۶۔ صبر و تحمل:

پہلے بتا چکا ہوں کہ ان کی چال ڈھال ان کے مزاج کے ٹھہراؤ کا مظہر تھی وہ ایک حلیم اور قانع انسان تھے۔ رواداری اور برداشت ان کے مزاج کی جزو لاینفک تھی۔ ھل من مزید کہ لالچ سے پاک تھے۔

۷۔ کم گو:

عام طور پر کم گو انسان تھے۔ بلا ضرورت بات نہ کرتے۔ اچھے سامع تھے، ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے تاہم خشک مزاج نہ تھے۔ خوش گوار باتوں سے لطف اُٹھاتے۔

۸۔ باعثِ رحمت نہ کہ باعثِ زحمت:

اللہ نے ان کو بہت کچھ دے رکھا تھا۔ آپ کاٹلنگ کے مضافات اور بازار میں کروڑوں کی جائیداد کے مالک تھے۔ لوندخوڑ کے فدا محمد خان کے خاندان سے ان کی رشتہ داری تھی اور مسلم لیگ کے چوٹی کے لیڈروں سے ان کے ذاتی مراسم تھے لیکن وہ تکبر و نمائش سے کوسوں دور اور مجتنب رہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی اور مالی حیثیت کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا۔ ان کی ہمیشہ کوشش رہی کہ وہ سب کے لئے باعثِ رحمت بنیں، تاہم اگر کسی کو فائدہ دینا ممکن نہ ہو تو اس کے لئے زحمت کا باعث تو بالکل نہ ہوں۔ ان کی اس خوبی کی اصل قدر و قیمت کے دوسرے لوگ معترف ہوں یا نہ ہوں لیکن کاٹلنگ کے باسی تو لازماً ہوں گے کہ انہوں نے مرحوم سے کم تر جائیداد کے حامل افراد کی زبان اور ہاتھ سے عام لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہوتے دیکھا۔ انہوں نے اپنی مالی حیثیت، اعلیٰ تعلیم، وسیع تعلقات اور صلاحیت کو لوگوں کے فائدے کے لئے استعمال کیا اور زندگی بھر کسی کے لئے زحمت کا باعث نہ بنے۔

۹۔ قناعت پسندی:

ان کی قناعت پسندی بھی قابل دید تھی۔ وہ چاہتے تو بازار میں تھوڑی سی جائیداد بیچ کر بڑی بڑی گاڑیاں رکھ سکتے تھے، عیش وعشرت اور شاہ خرچیاں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے سادہ زندگی گزاری۔ اکثر پیدل یا تانگے پر سفر کرتے۔ انہوں نے فضول خرچی اور دولت کی نمود ونمائش سے سختی سے اجتناب کیا۔ وہ اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے اوروں پر خرچ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

۱۰۔ ایمانداری:

انہوں نے طویل عرصہ سیاست کی، کئی بار صوبائی اسمبلی کے لئے انتخاب لڑا۔ تاہم وہ جیت نہ سکے۔ مرحوم کرپشن سے متنفر ایک وضعدار، شریف اور ایماندار انسان تھے جن کے لئے بدقسمتی سے وطن عزیز میں سازگار ماحول اور وسیع عوامی حمایت ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی۔ ۱۹۸۸ء میں سابق گورنر صوبہ سرحد جنرل (ر) فضل حق مرحوم کی موجودگی میں کاٹلنگ میں اپنے انتخابی جلسے میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بہانگ دہل فرمایا تھا۔ ''مجھے کرپشن سے نفرت ہے۔ میرے پاس اللہ کا دیا جو کچھ ہے، وہ میرے لئے اور میرے اکلوتے بیٹے کے لئے عمر بھر کافی ہے۔ میں نے اپنی اولاد کو ہمیشہ حلال کا لقمہ کھلایا ہے اور آئندہ بھی ان کو حرام سے بچانا میری خواہش ہے۔ میں نہ کرپشن کروں گا نہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اپنے الیکشن پر بھی اپنی حلال کمائی کے پیسے خرچ کرتا ہوں۔ اگر مجھے موقع ملا تو سرکاری فنڈز کو عوام کی امانت سمجھ کر خرچ کروں گا۔''

۱۱۔ یاروں کے یار:

مرحوم محفل آرائی کے دلدادہ تھے۔ دوستوں کی محفلیں سجانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ یاروں کے یار تھے۔ اپنے حاجت مند دوستوں کی پابندی سے مدد کیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ

اپنے چند ضرورت مند دوستوں کو بازار میں اپنی چند دکانوں کا کرایہ اپنے لئے اکٹھا کرنے کی اجازت بھی دی تھی تاکہ وہ اپنی ضرورتیں پوری کرسکیں۔

۱۲۔ وسیع معاشرتی ربط:

مرحوم لوگوں کی غمی شادی میں پابندی سے شرکت کرتے۔ دور یا نزدیک، ہر جگہ فاتحہ خوانی میں شریک ہوتے، بیمار پرسی کرتے اور حتی المقدور مدد بھی کرتے۔

۱۳۔ نشے سے پرہیز:

ان کی مثالی شخصیت کا ایک اور نمایاں وصف یہ تھا کہ سگریٹ کے علاوہ ہر قسم کے نشے سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ ان کے والدین کی تربیت کا کمال تھا، ان کا ذاتی بڑا پن بھی اور یقیناً ان کے قریبی رفقاء کی محفل کا اثر بھی کہ انہوں نے نشے سے مکمل پرہیز کیا اور کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یاد رہے یہاں اکثر ان سے کم مالی حیثیت کے لوگ نشے میں دھت بازار میں شور وغوغا کرتے نظر آئے ہیں۔

۱۴۔ پکے مسلم لیگی:

کچھ لوگ اپنی سیاسی پارٹی اتنی جلد بدلتے ہیں جتنا وقت نہرو، بقول ان کے اپنا پاجامہ بدلنے میں بھی نہیں لیتے تھے۔ مرحوم کی پہچان ایک مسلم لیگی کی تھی اور اُن کی یہ پہچان ساری عمر برقرار رہی۔ اُنہیں ملک وقوم سے بہت محبت تھی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لئے قائد اعظم کی خدمات کے بہت معترف تھے۔

مرحوم یارقند خان کی شخصیت ان گنت خوبیوں کا مرقع تھی۔ وہ مخلص دوست، شفیق باپ، عظیم انسان اور باکمال اصول پسند سیاستدان تھے۔ ان کی شخصیت کا احاطہ ایک مختصر تحریر میں کرنا مشکل تھا۔ یہ چند تاثرات پیش خدمت ہیں۔ ان کے ذریعے بس ان کو بعد از وفات خراج تحسین پیش کرنا اور ان کے اکلوتے برخوردار اور پیارے بھائی ڈاکٹر شبیر احمد خان کے حکم

کی بجا آوری مقصود تھی۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے اہل و عیال، دوستوں اور ہم سب کو ہر قسم کی مصیبتوں، آزمائشوں اور حاسدوں سے بچائے رکھیں۔ آمین۔

طاہر علی
پرنسپل

میرے رول ماڈل

یارقند خان جو کہ رشتے میں میرے نانا تھے انتہائی شفیق اور پیار کرنے والے انسان تھے۔ جب تک وہ زندہ تھے اللہ کے بعد وہ ہی ہمارے سب کچھ تھے۔ وہ ہم سے بے حد پیار کرتے تھے اور انتہائی شفقت فرماتے تھے اور ہماری ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ وہ ہماری چھوٹی بہن کائنات سے بہت محبت کرتے تھے اور اُن کے ساتھ خصوصی گپ شپ لگاتے تھے۔ میرے نانا ایک اچھے سیاستدان تھے لیکن سماجی خدمت اُن کی سیاست کا محور تھی۔ سیاست کو خیر باد کہنے کے باوجود بھی وہ معاشرتی بہبود کے لئے کوشاں رہتے اور لوگوں کی ممکنہ حد تک مدد کرتے تھے۔

میرے نانا جن کو ہم سب داجی کہتے تھے صلہ رحمی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی بہت سی مثالیں میں نے خود دیکھی ہیں۔ اتنا مال و دولت ہونے کے باوجود سادہ زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ اُن کے پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اگر وہ کسی شادی وغیرہ میں جاتے تو ان کا ایک دور کا بھانجا تھا جس کے پاس انتہائی پرانی گاڑی تھی وہ اس میں جاتے۔ ایک دفعہ میرے نانا، نانی اور بڑا بھائی خلیل جبران اس کی گاڑی میں موضع کنج گئے تھے چونکہ اس کی گاڑی پرانی تھی تو سارے پرزوں سے مختلف قسم کی آوازیں آرہی تھی اور سفر بھی آرام دہ نہیں تھا گھر پہنچتے ہی بھائی نے شکایت کی کہ داجی آپ پیسے بھی زیادہ دیتے ہیں اور پھر بھی اس پرانی گاڑی میں سفر کرتے ہیں تو داجی نے کہا کہ اگر میں کسی اور کو پیسے دوں تو کیا یہ اچھا نہیں کہ یہ میرا رشتہ دار بھی ہے اور غریب بھی ہے تو اس کی مزدوری ہو جائے۔

اسی طرح ہمارے محلے میں ایک دکاندار ہے جو کہ داجی کا رشتہ دار بھی ہے وہ بازار

سے سودا لا کر بیچتا ہے ظاہر سی بات ہے کہ وہ کلو کے حساب سے دس یا بیس روپے زیادہ لیتے تھے۔ گھر والے کہتے تھے کہ بازار سے سودا لیا کرو لیکن داجی مجھ سے کہتے کہ جو بھی ہو اس دکاندار سے سودا لیا کرو کیونکہ اس نے محلے میں ہمارے لئے تو دکان کھولی ہے اگر ہم نہیں خریدیں گے تو اور کون ان سے خریدے گا۔

علاقے کا خان ہونے کے باوجود وہ انتہائی خاکسار اور سادہ انسان تھے ایک دفعہ میں نے جمعہ کی نماز پڑھی اور مسجد سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ داجی نے آستین چڑھائی ہوئی تھیں اور نالی کو ہاتھ سے صاف کر رہے تھے۔ نالی گند سے بھری ہوئی تھی اور پانی راستے میں بہہ رہا تھا اور لوگوں کو تکلیف ہو رہی تھی میں نے جلدی سے آستین چڑھائی اور نالہ کو صاف کرنا شروع کیا اور داجی سے کہا کہ آپ چھوڑ دیں۔ میرے ساتھ دو تین دوست بھی اس کارِ خیر میں شریک ہوئے جب ہم نے نالہ صاف کیا تو داجی نے ہمیں بطورِ انعام کچھ پیسے بھی دے دیئے۔

داجی غریبوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں جب بازار میں اُن کے ساتھ جاتا تو مجھے کہتے کہ تم رکو میں ابھی آیا وہ روڈ پار کر کے کسی سے ملتے اور ہاتھ میں کچھ دے دیتے میں چھوٹا تھا اس لئے سمجھ نہیں آتا کہ کیا کر رہے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ داجی کو بازار میں کوئی غریب نظر آتا تو خود جا کر اُن کو پیسے دے دیتے۔

ایک بزرگ عالم دین کا قول ہے کہ مسکینوں کی مدد کا مطلب صرف یہ نہیں کہ اُنہیں ایک وقت کی روٹی دی جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ بے روزگار لوگوں کو تعلیم اور روزگار کے ذرائع مہیا کر کے معاشرے کا مفید رکن بنایا جا سکے۔ داجی حتی الوسع اس اصول پر عمل کرتے تھے۔ جب کوئی روزگار شروع کرنا چاہتا اور وسائل کم ہوتے تو داجی اس کی مدد کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بندہ کباب کا کام کرتا تھا اس کے پاس بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی داجی نے اس کے لئے میز اور کرسیوں کا بندوبست کیا۔ اسی طرح محلے میں جو بیروزگار ہوتے تو داجی اس کو کوئی کام دے دیتے اور اس کے عوض مزدوری سے زیادہ پیسے دے دیتے۔

داجی بچوں پر بہت شفقت فرماتے تھے اگر راستے میں کوئی بچہ روتا ہوا ملتا تو وہ ان سے پوچھتے کہ بیٹا کیوں رو رہے ہو۔ پھر ان کو پیسے دے دیتے کہ رومت جاؤ اپنے لئے کچھ خریدو۔ بارش کی وجہ سے جب راستہ خراب ہو جاتا اور لوگوں کو آنے جانے میں مشکلات ہوتیں تو داجی اکثر اپنے پیسوں سے وہ راستہ ٹھیک کروا دیتے۔ اسی طرح جب پل خراب ہو جاتا جو کہ گاڑیوں کی آمدورفت کا ذریعہ تھا تو داجی اس کو ٹھیک کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اسی جذبۂ خدمت کی وجہ سے وہ معاشرے میں بہت پسند کئے جاتے تھے۔

داجی کا معمول تھا کہ وہ صبح بالاخانہ جاتے اور دوپہر کو واپس آ جاتے۔ پھر عصر کو جاتے اور عشاء کو واپس آتے تھے۔ ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ جب آپ اندھیرے میں قبرستان سے گزرتے ہیں تو آپ کو ڈر نہیں لگتا تو داجی نے مسکرا کر کہا کہ ''نہیں''۔ پھر مجھے بتایا کہ ایک دفعہ میں تھوڑا لیٹ ہوا۔ اسی راستے پر اکثر ڈاکو بیٹھتے اور لوگوں کو لوٹتے تھے۔ میں جب آ رہا تھا تو مجھے لگا کہ وہاں پر کچھ بندے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے آواز دی کہ رُکو۔ میں نے کہا کون ہے؟ اُن میں سے ایک بندے نے میری آواز پہچان لی اور کہا کہ چیئرمین صاحب یہ آپ ہیں۔ پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ پیچھے ہو جاؤ یہ تو چیئرمین صاحب ہیں۔ جاتے ہوئے کہا کہ پھر زیادہ دیر کو اس راستے پر نہ آیا کریں آج کل حالات ٹھیک نہیں۔

داجی کی تربیت اور اُن کے زیادہ قریب رہنے کی وجہ سے مجھ میں بہت سی اچھی عادات پیدا ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے میرے اچھے اعمال کا اجر یقیناً ان کو ملے گا۔ داجی ہمارے دلوں میں زندہ تھے، ہیں اور رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کی ابدی زندگی میں خوش رکھیں اور اُن کے درجات بلند فرمائے۔ آمین ثم آمین

عدنان بشیر

نواسۂ یارقند خان

یارقند خان کی
شگفتہ تحریریں

بیادِ صحبتِ یارانِ چمن

میرے دوست ایک خوبصورت گلدستے کی طرح ہیں اُن میں ہر مزاج اور ہر طبیعت کے افراد شامل ہیں ۔ نرم مزاج والے بھی اور گرم مزاج والے بھی ، بزرگ بھی اور جوان بھی ، معاملہ فہم اور سنجیدہ دوستوں کے ساتھ ساتھ ایسے دوستوں کی بھی کمی نہیں جن میں مزاح اور دوستانہ شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ہر وقت مختلف قسم کی دلچسپ سرگرمیاں جاری رہتی ہیں اور بوریت کے لمحات کم ہی آتے ہیں ۔ اس دوران بعض دوست وقتی طور پر ناراض بھی ہو جاتے ہیں لیکن کچھ عرصہ بعد وہ خود ہی راضی ہو جاتے ہیں یا دوسرے دوست اس کو منا لیتے ہیں اور دلوں میں کدورت نہیں آنے دیتے ۔ اسی طرح ہماری دوستی کا قافلہ برسوں سے رواں دواں ہے اور حالات کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود ابھی تک اپنے سفر کو کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہیں جس کے لئے سارے ساتھی داد و تحسین کے مستحق ہیں ۔

ہمارے ساتھیوں میں ملک سبز علی خان کا ایک نمایاں مقام ہے اگر چہ عمر میں مجھ سے کافی چھوٹے ہیں لیکن اپنی بھاری بھرکم اور معزز شخصیت کی وجہ سے ہر جگہ مرکزِ نگاہ بن جاتے ہیں ان کی لمبی داڑھی ان کی شخصیت کو مزید بارعب بناتی ہے ۔ وہ ہمارے ساتھ جہاں بھی جاتے ہیں سارے لوگ ان کی عزت اور خاطر مدارت میں لگ جاتے ہیں اور ہماری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتے ۔ ایسے میں مجھے اور فقیر گل خان کو بہ امر مجبوری اُن کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ اگر چہ ملک صاحب داڑھی کی وجہ سے بزرگ نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ عمر کے لحاظ سے ہم سے بہت چھوٹے ہیں ۔ اس پر مجھے اپنے بڑے بھائی حاجی زرقند خان مرحوم یاد آ جاتے ہیں جنھوں نے

ہمارے خاندان میں سب سے پہلے حج بیت اللہ کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ وہ حج کرنے کے بعد بھی کچھ عرصے تک شیو کرتے رہے لیکن بعد میں اچانک انہوں نے داڑھی رکھ لی۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو حاجی صاحب نے کہا کہ داڑھی انہوں نے مجبوراً رکھی ہے کیونکہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں تو وہاں سے واپسی پر لوگ اُنہیں کہتے ہیں کہ حاجی صاحب کو ہمارا سلام ضرور کہنا۔ دراصل لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حج ہمارے دوسرے بھائی ملک صنوبر خان نے کیا ہے کیونکہ ایک متشرح انسان ہونے کی وجہ سے اُن کی جوانی ہی میں لمبی داڑھی تھی۔

ملک سبز علی خان اپنی بارعب شخصیت کے ساتھ ساتھ طبیعت کے بھی جلالی ہیں اور بہت جلد غصہ میں آ جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اُن کے رعب میں بھی آ جاتے ہیں لیکن درحقیت وہ دل کے بہت نرم اور درگزر کرنے والے انسان ہیں۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جتنی جلدی غصہ میں آ جاتے ہیں اُسی طرح جلدی غصہ تھوک بھی دیتے ہیں۔ اُن کی اس خوبی سے بعض دوست کبھی کبھار ناجائز فائدہ اُٹھا کر اُنہیں مختلف طریقوں سے تنگ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن ملک صاحب اپنے وقتی غصہ کے باوجود ایک شفیق بزرگ کی طرح اُن کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہماری نظر میں اُن کی عزت اور بڑھ جاتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ زراب گل المعروف خان اُستاد کی موجودگی میں ملک صاحب اور فقیر گل خان کے درمیان کسی بات پر تکرار ہوئی جس سے ملک صاحب جلال میں آ گئے۔ بات مزید بڑھی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی چونکہ ہم درمیان میں موجود تھے اس وجہ سے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن اس دوران فقیر گل خان کا ہاتھ نادانستہ طور پر ملک صاحب کی داڑھی تک پہنچا اور بیچ بچاؤ کے درمیان کچھ بال اُن کے ہاتھ میں رہ گئے۔ اس بات کا بعد ازاں فقیر گل خان کو بہت افسوس ہوا۔ اتفاقیہ طور پر انہی دنوں فقیر گل خان نے کسی جگہ ایک مولانا صاحب کو داڑھی کی اہمیت اور عزت کے بارے میں تقریر کرتے سنا۔ اُن کو اتنی ندامت ہوئی کہ اس تقریب سے فوراً اُٹھے اور گاؤں کی طرف روانہ ہوئے اور سیدھے ملک صاحب کے گھر پہنچے

اور اُن سے معافی کے طلبگار رہوئے۔ ملک صاحب نے نہ صرف اُن کو معاف کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر فقیر گل خان نہ آتے تو اس شام ملک صاحب خود اُن کے گھر آنے والے تھے۔

ملک صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں اگر گنواؤں تو بہت وقت لگے گا۔ انہوں نے سیاست میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور کسی مالی اور جانی قربانی سے دریغ نہیں کیا جس کے لئے میں اُن کا بہت ممنون ہوں۔

اگرچہ عام انسانوں کی طرح ملک صاحب میں بھی کئی خامیاں اور کمزوریاں ہیں جس کو ہمارے بعض دوست بڑھا چڑھا کر نمایاں کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کی خوبیوں کا پلڑا اس سے کہیں زیادہ بھاری ہے۔

فقیر گل خان کی تعریف گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے وہ دوستی، وفاداری، شرافت اور بے لوث خدمت کا ایک مجسمہ ہیں۔ اُن کی انتظامی صلاحیتوں کی ایک دنیا معترف ہے۔ اُن کا ذہن بہت زرخیز ہے وہ کسی بھی مشکل کا حل منٹوں میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ یہ اور بات کہ ان کے تجویز کردہ حل اکثر اوقات قابل عمل نہیں ہوتے لیکن پھر بھی ان کے دماغ کی تیزی کی داد دینی پڑتی ہے۔ اُن کی ایک عجیب عادت ہے کہ جب بھی کوئی دعوت ہوتی ہے وہ صبح سویرے پہنچ جاتے ہیں اور اپنے ساتھ کپڑوں کا ایک پاک صاف فالتو جوڑا لے آتے ہیں۔ اس کے بعد وہ انتظامی امور میں دل و جان سے مصروف ہو جاتے ہیں اور اپنے پورے تجربے کو بروئے کار لا کر ہر چیز کا انتظام اس کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک کر لیتے ہیں اور جب فارغ ہو جاتے ہیں تو خوب نہا کر اپنے ساتھ لائے ہوئے پاک وصاف کپڑے زیبِ تن کر لیتے ہیں اور اکثر اوقات شہزادوں کی طرح خوبصورت نظر آنے لگتے ہیں اور محفل کی شان بڑھا دیتے ہیں۔ جب مہمان رخصت ہو جاتے ہیں تو پھر سارے پروگرام کا ایک تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ مجھے فقیر گل خان سے بہت محبت ہے۔ آج سے کئی سال پہلے جب فقیر گل خان بہت چھوٹے تھے مجھے اُنہیں بار بار دیکھنے کے مواقع ملتے تھے۔ میں نے بلکہ ہم سب

نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ایک بہترین انسان بنے گا۔ غالباً سن 70-1969ء سے ہماری دوستی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اُن دنوں فقیر گل خان میدان سیاست کے نئے شہسوار تھے۔ اگرچہ ہم دونوں کی سیاسی پارٹیاں الگ تھیں لیکن ان کی شخصیت کی کشش اور معاملہ فہمی نے دوستی اور بھائی چارے کو بڑی تیزی سے پروان چڑھایا اور کبھی سیاست کی تلخی کو دوستی میں حائل ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ بعد میں اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگا کر الیکشنوں میں میرے دست و بازو بنے رہے اور اپنے جیب سے ہزاروں روپے خرچ کر ڈالے۔ اُس وقت سے لے کر آج تک جب بھی مجھے اُن کی ضرورت پڑی ہے انہوں نے دل و جان سے میری مدد کی ہے۔ اگر میرا خون بھی کبھی اُن کے کام آجائے تو میرے لئے یہ مہنگا سودا نہیں ہوگا۔ فقیر گل خان میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہے اور ان سے یہ رشتہ انشاءاللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

ہمارے ساتھیوں میں گل فراز خان کا ایک اہم مقام ہے۔ وہ ایک سنجیدہ مخلص اور ہمدرد انسان ہیں۔ سیاست سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور عوام میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اُن کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ اُنہوں نے سیاست میں میرا بھرپور ساتھ دیا اور میرے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1985ء کے انتخابات میں میری ناکامی پر شدت جذبات سے رو پڑے جس پر میں نے اسے دلاسہ دیا کہ سیاست میں ایسے موقع آتے رہتے ہیں اور آدمی کو ہر طرح کی صورتحال کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ بعد ازاں ہمارے درمیان کچھ اختلافات بھی پیدا ہوئے لیکن اس کے باوجود انہوں نے میری عزت کرنے میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں خوش وخرم اور آباد رکھے۔ آمین۔

دلبر خان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ایک دلچسپ انسان ہیں، شخصیت میں اتنی کشش ہے کہ ملک سبز علی خان کے علاوہ سارے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ایک کمالِ بے نیازی کے ساتھ چلتے ہیں اور ارد گرد پر نظر ڈالتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک

دفعہ ملک سبز علی اور یار محمد خان کی آپس میں لڑائی ہوئی اور دونوں ہمارے گروپ سے چلے گئے۔ میں نے فقیر گل خان کو اُن کے ٹکر کا آدمی ڈھونڈنے کو کہا۔ اُن کی نگاہِ انتخاب دلبر خان پر پڑی۔ ہم دونوں دلبر خان سے ملنے اُن کے گھر گئے لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھے ہم انہیں ڈھونڈتے نہر کے کنارے پہنچے جہاں پر کچھ لوگ جمع تھے اور دلبر خان اُن کے سامنے تقریر کر رہے تھے۔ یہ دیکھنا تھا کہ میں نے فقیر گل خان کے انتخاب کی دل میں داد دی۔ کہ یہ شخص واقعی ملک صاحب کے ٹکر کا ہے۔ جب وہ تقریر سے فارغ ہوئے تو ہم نے اُن کو اپنے گروپ میں شامل ہونے کی دعوت دی جو انہوں نے کچھ توقف کے بعد قبول کی اور اس دن سے آج تک ہماری پارٹی کے اہم رکن ہیں۔

جب دلبر خان پہلی دفعہ ہمارے ساتھ اڈے آئے جہاں ہم یوسف خان چپل والے کے ساتھ اُس کی دکان میں بیٹھے تھے تو انہوں نے دُکان میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے فوراً اُن کے لئے کرسی کا انتظام کیا اور وہ بے نیازی کے ساتھ اس پر بیٹھ گئے۔ میں نے دل میں کہا کہ دلبر خان کو اپنی اہمیت کا خوب احساس ہے۔ جب کچھ عرصہ بعد ملک سبز علی راضی ہو کر دوبارہ ہمارے پاس آئے تو انہیں احساس ہوا کہ اب ہمارے پاس اُن کا توڑ دلبر خان کی شکل میں موجود ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان دوستانہ اور کبھی کبھار مخالفانہ نوک جھونک کا وہ مشہور سلسلہ شروع ہوا جو بہت دیر تک جاری رہا اور ہم سب کی دلچسپی کا باعث بنا رہا۔ لیکن اس نوک جھونک کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے ہیں اور کسی بات کو دل میں نہیں رکھتے تھے۔ دراصل وہ دونوں دل کے بڑے صاف ہیں اور کسی کو جان بوجھ کر تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے۔

دلبر خان کے بہت سے قصے مشہور ہیں جن میں سے کچھ آگے بیان ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک خدمت گزار انسان بھی ہیں اور دوستوں کی خدمت کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مجھ پر ان کے بہت سے احسانات ہیں اُنہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور کسی بھی جانی یا مالی

قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

ہمارے دوستوں میں گل خان تھوڑا سا جذباتی انسان ہیں لیکن دل کے بڑے اچھے ہیں۔ دل کی مثال آئینے کی طرح ہوتی ہے جب آئینے پر تھوڑا سا بال پڑ جاتا ہے تو صاف نظر آتا ہے۔ باتوں یا گپ شپ کے دوران اگر کوئی بات گل خان کی طبیعت پر ناگوار گزرے تو فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ناراض ہو گئے ہیں۔ یہ تو خیر اُن کی کمزوری شمار ہوگی لیکن ان کی خوبیوں کا اگر تذکرہ کیا جائے وہ بے شمار ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ گل خان کے میرے اوپر کئی احسانات ہیں۔ انہوں نے میرے لئے مالی اور جانی قربانیاں دی ہیں۔ تمام دوستوں کی ہر طرح کی خدمت کی ہے۔ یہاں کے تمام لوگوں کے غم اور شادی میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہوتے رہے ہیں اور کالو خان میں جب ان کے اپنے غم یا شادی کا موقع آیا ہے تو یہاں سے سینکڑوں لوگ وہاں گئے ہیں۔ گل خان نے کاٹلنگ کے لوگوں کی مہمانداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور خاص کر میرے اور میرے دوستوں کا خصوصی خیال رکھا ہے۔ یہ اور بات کہ ڈاکٹر اجمل صاحب ان کی مہمان نوازی سے پوری طرح خوش نہیں ہیں اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے ان کے نمبر کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب یہ کوئی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ انہیں گل خان کے حجرے میں کوئی ایک بھی خوبصورت شخص نظر نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب کونسا وہاں برسوں رہے ہیں وہ تو تھوڑی دیر کے لئے وہاں جاتے ہیں اس دوران ان کو کیا نظر آ سکتا ہے؟ اور اگر بالفرض یہ صحیح بھی ہو تو اس میں گل خان کا کیا قصور ہے۔ ڈاکٹر صاحب بعض اوقات بال کی کھال اُتارنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

گل خان نے میرے کاموں میں اپنے جیب سے بہت سے پیسے خرچ کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے موقع دے کہ اُن کے بچوں کی خدمت کر سکوں۔ بے اختیار دل سے اُن کے لئے زندہ باد کی صدا نکلتی ہے۔

ہمارے دوستوں میں ڈاکٹر اجمل خان بھی بڑے قیمتی انسان ہیں کئی خوبیوں کے

مالک ہیں۔ دریا دل انسان ہیں اور دوستوں پر خرچ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ کسی بھی انسان کی برائی نہیں چاہتے دیانتداری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر کوئی انسان اس کو دھوکہ دے تو درگزر کرتے ہیں اور آئندہ کے لئے اس شخص سے خود کو بچائے رکھتے ہیں۔

گپ شپ کے انتہائی شوقین ہیں۔ دوستوں کی محفل میں خوب کھلتے ہیں اور محفل کی جان نظر آتے ہیں۔ کسی دوست کو بے وقوف بنانا ڈاکٹر صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور پھر اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک دیگر دوستوں کو پورا واقعہ مزے لے لے کر سنا نہیں دیتے۔

اگرچہ ڈاکٹر صاحب دوستوں پر کھلے دل سے خرچ کرتے ہیں لیکن جب اُنہیں پتہ چلتا ہے کہ دوست لالچ میں آکر اُن کی جیب پر چھاپہ مارنے کی منصوبہ بندی کرر ہے ہیں تو کمال ہوشیاری سے لالچی دوستوں کا منصوبہ ناکام بنا دیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب ڈاکٹر صاحب ٹوپی ہسپتال میں تعینات تھے تو سارے دوست ایک فلائنگ کوچ میں بیٹھ کر ان کی سرکاری رہائش گاہ پہنچے اور ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونا چاہا لیکن ڈاکٹر صاحب نے کمال ڈھٹائی سے اُنہیں دروازے سے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ فارغ نہیں ہیں۔ اس پر دوست بہت عرصے تک سخت ناراض رہے لیکن ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ تھا کہ اگر وہ اس وقت ان کی آؤ بھگت کرتے تو دوست اس کو ایک معمول بنا لیتے اور پھر ہر وقت وہاں آرہے ہوتے۔

ایک انسان ہونے کے ناطے ڈاکٹر صاحب میں کئی خامیاں بھی ہوں گی لیکن وہ دل کے بڑے اچھے ہیں اور جان بوجھ کر کسی کو تکلیف دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مزاح کے ماہر ہیں ان کا مقصد خود کو اور دوستوں کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد کسی کی تذلیل کرنا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ اُن میں سے چند آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ملازمت کے اولین دنوں میں پاک فوج میں تھے اور اُن کی

پوسٹنگ بلوچستان کے ضلع کوہلو میں تھی۔ وہاں پر میجر ریٹائرڈ نعیم صاحب جو بعدازاں ہمارے صوبے کے چیف سیکرٹری بھی رہے اُن دنوں ڈپٹی کمشنر تعینات تھے اور احسن مختار صاحب جو بعد میں ڈی آئی جی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے بھی وہاں پر نوکری کر رہے تھے۔ ان تینوں کے درمیان بہت دوستی ہوگئی اور ڈاکٹر صاحب اور احسن مختار صاحب تقریباً روزانہ ڈپٹی کمشنر کے بنگلے میں جا کر نعیم صاحب کے ساتھ شام کو گپ شپ لگاتے تھے ان دنوں ڈپٹی کمشنر کی بہت بڑی حیثیت ہوتی تھی اور وہ چونکہ عمر میں بھی دونوں سے بڑے تھے اس لئے ڈاکٹر صاحب اور مختار صاحب اُن کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ میجر نعیم صاحب اُن دنوں عوامی نیشنل پارٹی سے متاثر تھے اور اس کے لیڈروں کی بہت تعریفیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اور مختار صاحب بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے تھے اور یہ سلسلہ مہینوں تک جاری رہا۔ پھر بعد میں نعیم صاحب کسی بات پر نیشنل پارٹی سے ناراض ہوگئے اور ایک شام کہا کہ افسوس کہ میں اُن لوگوں کو اچھا سمجھتا رہا لیکن یہ تو بڑے خراب لوگ نکلے۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور مختار صاحب نے بھی اُن کے خلاف باتیں شروع کیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب حیران ہوکر دونوں کا منہ تکنے لگے کہ کل تک تو یہ دونوں اُن کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے اور آج یک دم اُن کے مخالف ہوگئے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے معصومانہ لہجے میں کہا۔ ''سر! ہم تو پہلے ہی سے ان کے مخالف تھے میرا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اور مختار صاحب پیپلز پارٹی کو پسند کرتے ہیں یہ تو ہم آپ کی وجہ سے اُن کی تعریفیں کرتے تھے ورنہ ہم تو انہیں قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔'' یہ سن کر نعیم صاحب بہت محظوظ ہوئے اور ہنس کر کہنے لگے کہ اس عرصہ کے دوران انہوں نے اپنی باتوں سے ڈاکٹر صاحب اور مختار صاحب کو کافی تنگ کیا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے دل میں کہا کہ آپ کہ مہمان نوازی کے مزے لوٹنے کی یہ ایک حقیر قیمت تھی جو ہم بخوشی ادا کرتے رہے۔

ایک دفعہ محفل میں سید منور شاہ صاحب کا ذکر ہو رہا تھا جو کہ انجینئر ہیں اور میرے بیٹے

کے سسر ہیں کسی نے کہا کہ اُن کی چپلیاں بہت خوبصورت اور انوکھے ڈیزائن کی ہیں اور ایک خاص کاریگر احسان اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا ایسی چپل نہیں بنا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب گفتگو کے دوران جوش میں آ گئے اور حمید گل خان سے کہا کہ وہ اس وقت شاہ صاحب کے گھر جا کر اُن کی چپل دیکھے اور بالکل اس ڈیزائن کے مطابق ایک جوڑا بنوائے۔ ساتھ ہی اُن کو کرایہ بھی دے دیا اور حمید گل خان روانہ ہوا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد گل خان بالا خانہ سے نیچے گئے اور واپس آ کر گھبراتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ حمید گل نے عبدالکریم مرزا صاحب کی دکان پر ٹیلیفون کیا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ منور شاہ صاحب نے غصہ میں آ کر اُنہیں اپنے گھر کے تہہ خانے میں بند کر دیا ہے۔ اور اُن کو پولیس کے حوالے کرنے والے ہیں۔ مہربانی کر کے آ کر اُنہیں چھڑانے کی کوشش کریں۔ ہم سب گھبرا گئے لیکن ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر خوف سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کسی ستم ظریف غالباً گل خان نے یاد دلایا کہ یہ تو ڈاکٹر صاحب کی تجویز تھی کہ حمید گل اُدھر جائے اس لئے ڈاکٹر صاحب کو خود جا کر اُنہیں بچانا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب یکدم غصہ میں آ گئے اور کہنے لگے۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اُسے کہا تھا لیکن کیا اُس کے دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا تھا۔ اسے خود نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر میں اُسے کہوں کہ چھت سے چھلانگ لگاؤ تو کیا اسے چھلانگ لگانا چاہیے؟ یہ سب حمید گل کا کیا دھرا ہے اور اب اسے خود بھگتنے میں پاگل ہوں کہ اُسے چھڑانے وہاں جاؤں۔'' یہ سن کر ہمیں افسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں اس شخص کو خود انہوں نے بھیجا اور اب جب وہ تکلیف میں ہے تو اس کی مدد کرنا تو درکنار اس کے ساتھ ہمدردی تک نہیں۔ رہ رہ کر حمید گل خان کا خیال آ رہا تھا وہ بیچارا کتنی اذیت سے گزر رہا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ شاہ صاحب نے اُس کی پٹائی کی ہو کیونکہ وہ غصہ کے بڑے تیز ہیں۔ نہ جانے پولیس والوں نے اُنہیں کس دفعہ کے تحت گرفتار کیا ہوگا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ ساتھ ہی ہم سب اُسے چھڑانے کی مختلف تجاویز پر غور کر رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ حمید گل خان خوش وخرم بالا خانہ کی سیڑھیوں پر اوپر آتے

دکھائی دیئے ہم سب کی جان میں جان آئی اور خوشی سے بے اختیار ان کی طرف بڑھنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب سب سے آگے تھے اور حمید گل خان کو گلے لگایا اور مبارکباد دی۔ وہ ہمارے رویے پر بہت حیران ہوئے اور کہا کہ کیا ہوا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ شاہ صاحب بہت اچھے انسان تھے اور ان کی بہت عزت افزائی کی اور چائے وغیرہ بھی پلائی اس کے ساتھ ساتھ چپلیاں بھی دکھائیں۔ دراصل یہ گل خان کی شرارت تھی انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو تنگ کرنے کے لئے ٹیلیفون کا ڈرامہ رچایا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے غالباً اپنی خفت مٹانے کے لئے یا حمید گل خان کو راضی کرنے کے لئے جو کہ پورا واقعہ سننے کے بعد بھی کوئی خاص خفہ نہیں تھے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور چائے اور بسکٹ کا آرڈر دے دیا اور سب کو راضی کر لیا۔

ڈاکٹر صاحب ایک بہترین شاعر بھی ہیں۔ وہ اتنے قادر الکلام ہیں کہ اگر چاہیں تو ایک قلیل وقت میں ایک نظم یا غزل لکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ارشاد خان جو ای این ٹی سپیشلسٹ ہیں اور میرے داماد ہیں ڈاکٹر اجمل کے دوست ہیں۔ وہ جب کسی سے ڈاکٹر اجمل کا تعارف کراتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر اجمل دلسوز صاحب ہیں جو شاعر ہیں اور ان کا غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔ اکثر لوگ بعد میں ڈاکٹر ارشاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ غیر مطبوعہ کلام کیا چیز ہے اور ڈاکٹر صاحب کو مجبوراً وضاحت کرنا پڑتی ہے کہ غیر مطبوعہ کلام کا مطلب ہے وہ کلام جو شائع نہ ہوا ہو۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ڈاکٹر اجمل نے کاٹلنگ سے ٹیکسی لی اور رستم کی طرف روانہ ہوئے جہاں پر ان کے ایک اعلیٰ سرکاری افسر دوست کے والد فوت ہو گئے تھے اور ڈاکٹر صاحب تعزیت کرنا چاہتے تھے راستے میں انہیں ڈاکٹر ارشاد اور ڈاکٹر عبدالواحد مل گئے تو ان کو بھی ساتھ بٹھا لیا کہ راستے میں گپ شپ ہو جائے گی۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تو ڈاکٹر ارشاد نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا کہا تا کہ وہ نماز ادا کر سکے۔ ڈاکٹر اجمل نے مشورہ دیا کہ نماز تعزیت کی جگہ پر پڑھ لیں کیونکہ وہ جلدی وہاں پہنچ جائیں گے جب وہ وہاں پہنچے اور فاتحہ خوانی

کی تو ڈاکٹر ارشاد نے وہاں لوگوں سے مسجد کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہاں پر تو مسجد نہیں ہے۔ ڈاکٹر ارشاد نے نسبتاً بلند لہجے میں حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسی جگہ ہے جہاں مسجد بھی نہیں ہے۔ اُن کی بات سن کر ڈاکٹر اجمل گھبرا گئے کیونکہ ان کے بقول وہاں پر مسلح گارڈز موجود تھے اور ڈاکٹر ارشاد کی طرف دیکھ رہے تھے اور ڈاکٹر اجمل کو یہ بھی احساس تھا کہ وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ ڈاکٹر ارشاد کی باتوں کو سن کر کیا کہیں گے۔ ڈاکٹر اجمل تیزی سے اُٹھے اور ڈاکٹر ارشاد کو اپنے ساتھ سائیڈ پر لے گئے اور اپنی طرف سے وضاحت دینے کی کوشش کی کہ لگتا ہے کہ یہاں کی زمینیں بہت قیمتی ہیں اس لئے لوگ مسجد کے لئے جگہ نہیں دیتے لیکن ان کی وضاحت سے ڈاکٹر ارشاد مطمئن نہیں ہوئے اور وہ مسجد کی غیر موجودگی کا شکوہ کرتے رہے۔ ڈاکٹر ارشاد نے مجبوراً وہاں پر بچھی ہوئی دریوں پر نماز ادا کی اور بعد میں ڈاکٹر اجمل نے مزید کسی ناخوشگوار واقعہ سے بچنے کے لئے جلدی سے اجازت طلب کی۔ وہ جب حجرے سے نکلے تو ڈاکٹر اجمل نے سکھ کا سانس لیا۔ راستے میں ایک دو جگہ پھر ڈاکٹر ارشاد نماز پڑھنے کے لئے اُترے اور مسلسل مسجد کی غیر موجودگی پر تبصرہ کرتے رہے۔ اس کی باتوں کو ڈاکٹر اجمل نے مجبوراً برداشت کیا لیکن جب وہ کاٹلنگ پہنچے تو ڈاکٹر اجمل صاحب نے شکر ادا کیا اور آئندہ ڈاکٹر ارشاد کے ساتھ کسی بھی سماجی تقریب میں اکٹھے جانے سے توبہ کر لی۔

ریداد گل کا ذکر کرنے لگا ہوں۔ بے اختیار دل دھڑک رہا ہے۔ دراصل اس شخص کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ لکھنا شروع کروں تو کاغذ کا یہ ٹکڑا ناکافی پڑ جائے۔ میں نے جب سے سیاست میں عملاً حصہ لینا شروع کیا ہے ریداد گل خان نے میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ سردی ہو یا گرمی جلسہ ہو یا جلوس وہ نہ صرف موجود رہے بلکہ پیش پیش رہے۔ میرے الیکشنوں میں جان توڑ محنت کرتے رہے اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کرتے رہے۔ بنیادی طور پر مسلم لیگی ہیں لیکن جب میں نے اُنہیں پیپلز پارٹی کے جلسہ جلوس میں بلایا ہے تو میری خاطر اس میں بھی شرکت کی ہے۔ مجھ سے کبھی کوئی شکوہ شکایت نہیں کی۔ نیک انسان ہیں اور ہمیشہ خود کو حرام خوری سے

بچائے رکھا ہے۔

پچھلے دنوں جب کچھ دوستوں نے میرے خلاف ایکا کرلیا اور مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو ریدادگل خان میری حمایت میں ڈٹے رہے۔ اپنے ضروری کام چھوڑ کر ہر روز بالا خانہ تشریف لاتے رہے اور مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ دیگر دوستوں کو بھی ساتھ لاتے رہے اور خوب گپ شپ لگاتے رہے اور ہمارا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ناراض دوستوں سے گرم جوشی کے ساتھ بحث کرتے اور اپنی حاضر جوابی سے اُن کو لاجواب کردیتے۔ ان کی انتھک کوششوں کی وجہ سے تقریباً سارے دوست ہمارے کیمپ میں واپس آگئے۔ یہ کامیابی دیدارگل خان کی وجہ سے ہوئی۔ میں دیدارگل خان کو دوستی کا ''وکٹوریہ کراس'' دے چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش اور آباد رکھے۔ آمین ثم آمین۔

نورغلام خان بے شمار خوبیوں کے حامل انسان ہیں۔ مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں جب اور جس وقت میں نورغلام خان سے ملتا ہوں تو میرے دل کو خوشی ہوتی ہے۔ میرے ساتھ دل سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیشہ ہر میدان اور ہر جگہ میرا ساتھ دیا ہے مجھ پر اس کے بڑے احسانات ہیں۔

نورغلام خان کو پتہ چلا کہ بعض دوست مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو فوراً بالا خانہ تشریف لائے اور ہماری ہمت بندھائی۔ دلبر خان کو ڈھونڈ کر لائے اور انہیں ہر روز بالا خانہ آنے کی تاکید کی اور خود بھی باقاعدگی سے حاضری شروع کی۔ ریدادگل خان کیساتھ مل کر مخالف دوستوں سے بحث کرتے اور نتائج سے لاپرواہ ہوکر میری حمایت میں لڑتے رہے اور آخرکار دوستوں کو واپس لانے میں کامیاب رہے۔

نورغلام خان ایک بہادر اور دریا دل انسان ہیں۔ خوب کماتے ہیں اور خوب خرچ کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے طارق کی شادی پر بہت پیسے خرچ کئے تھے۔ ایسا کھانا تیار کیا تھا کہ میں نے بہت کم ایسا خوبصورت اور لذیذ کھانا کھایا ہے۔ سب لوگ اس کھانے کی آج تک تعریف

کرتے ہیں۔خوش مزاج اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ دوستوں کے لئے نرم اور دشمنوں کے لئے فولاد کی طرح سخت۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش اور آباد رکھے۔

صوبیدار نور غنی خان ایک اچھے انسان ہیں۔ ہر حال میں خوش وخرم رہتے ہیں اُن کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی ہے۔ نیک انسان ہیں۔ تھانہ والی مسجد کو آباد کیا اور پیش امام کی دل و جان سے خدمت کرتے رہے۔ ایک دفعہ چھ سات غنڈوں نے جو سب کلاشنکوفوں سے مسلح تھے صوبیدار صاحب سے رقم کا مطالبہ کیا۔ صوبیدار صاحب نے غنڈوں سے انتظار کرنے کو کہا اور رقم لینے کے بہانے گھر چلے گئے۔ جب گھر سے نکلے تو ہاتھوں میں بھری ہوئی کلاشنکوف تھی اور غنڈوں کو للکار رہے تھے۔ تمام غنڈے دُم دبا کر بھاگ گئے۔ اس پر بھی صوبیدار صاحب کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور بعد میں غنڈوں کے سرغنہ کو تھانہ کے ایس ایچ او سے بے عزت کرایا اور وہ صوبیدار صاحب سے معافی مانگتا رہا۔ پھر کئی لوگوں کے کہنے پر اُسے معاف کیا۔

صوبیدار صاحب اصلاحی کمیٹی کے ایک اہم اور سرگرم رکن ہیں۔ آج کل اپنے کاروبار میں بہت مصروف ہیں لہٰذا دوستوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکتے اللہ تعالیٰ انہیں خوش اور آباد رکھے۔ آمین۔

نثار خان کے ذکر سے پہلے یہ عرض کردوں کہ یہ ہمارے گروپ میں نئے داخل ہوئے ہیں۔ ایک بہترین دریافت ہیں۔ جس نے بھی مجھ سے ملوایا ہے دل اُسے دُعائیں دیتا ہے۔ ایک خوبصورت اور خوش لباس انسان ہیں۔ جب دوستوں اور مہمانوں کی خدمت کرنے پر آتے ہیں تو دیکھنے والا عش عش کر اُٹھتا ہے۔ اس وقت نثار خان کو نہ کپڑوں کے خراب ہونے کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ گرمی سردی کی۔ بلکہ گرمی میں ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے جب نمودار ہوتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے گلاب کے پھول پر بارش کے قطرے پڑے ہوئے ہوں۔ جب بھی کسی پروگرام کے لئے چندے کا ذکر ہوتا ہے تو سب سے پہلے پیسے نکال کر دے دیتے ہیں۔ قدردان اتنے کہ جب بھی اس کے ہاں گیا اتنی قدر کی کہ دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔

صوبیدار صاحب ناہید شاہ خان ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔اُن کا روشن اور نورانی چہرہ دین سے ان کے لگاؤ کا پتہ دیتا ہے۔اللہ کے حضور سجدوں کی کثرت کی وجہ سے پیشانی پر محراب بن چکی ہے جو صاف نظر آتی ہے۔صوبیدار صاحب جب مسکراتے ہیں تو ان کا کتابی اور نورانی چہرہ جس میں سفید موتیوں جیسے دانت جڑے ہوئے ہیں بڑا دلکش نظر آتا ہے۔ یہ میں صوبیدار صاحب کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھ رہا بلکہ مجھے واقعی ایسا محسوس ہوتا ہے۔کم از کم مجھے صوبیدار صاحب کا چہرہ روحانی نور سے منور نظر آتا ہے۔صوبیدار صاحب کے پاؤں پر بھی نماز، کثرت قرآن خوانی اور ذکر اذکار میں دیر تک بیٹھنے کی وجہ سے نشان پڑھ چکے ہیں۔دین سے گہرے لگاؤ اور شغف نے ایک طرف اُن کی شخصیت کو نمایاں کیا ہے تو دوسری طرف دنیاوی کاموں کے کرنے میں بھی ایک انفرادیت بخشی ہے۔ میں صوبیدار صاحب کی جس خوبی سے سب سے زیادہ متاثر ہوں وہ ان کی دینداری ہے۔ وہ حرام خوری سے پرہیز کرتے ہیں اور حلال کمائی پر انحصار کرتے ہیں۔شاہی طبیعت کے مالک ہیں اور کھلے دل سے خرچ کرتے ہیں۔ فیض رسان اور ہمدرد شخص ہیں۔سینکڑوں لوگوں کو ان کے درمیان راضی نامہ کر کے تباہی و بربادی سے بچایا ہے۔ جب بھی انہیں پتہ چلتا ہے کہ دو اشخاص یا خاندان دست وگریباں ہونے والے ہیں تو فوراً پہنچ جاتے ہیں اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک دونوں کے درمیان صلح نہیں کرا دیتے۔

سچی بات یہ ہے کہ اس وقت پورے علاقہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ اصلاحی کمیٹی بابوزئی کاٹلنگ کے جنرل سیکرٹری ہیں۔مقامی پولیس سے بہترین تعلقات ہیں اور ان تعلقات کو لوگوں کی بھلائی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔خدا اسے خوش اور آباد رکھے۔آمین۔

ہمارے گروپ کا سب سے پسندیدہ اور ہر حال میں خوش رہنے والا شخص رضوان اللہ عرف راجہ خان ہے۔اگر چاہوں تو اس کے کارناموں پر ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھ سکتا ہوں۔ بڑے دلچسپ، انسان ہیں۔ ہمدردی اور خدمت کا جذبہ اس شخص میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے

میری مشکلات میں میرا بڑا سہارا ثابت ہوئے ہیں۔ کئی سال پہلے جب میں دکانوں کی تعمیر میں مصروف تھا تو میرے ساتھ کندھا ملائے کھڑے رہتے تھے۔ دُکانوں کو برسات کے پانی سے اس خوبصورتی سے بچاتے تھے کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔ دکانوں کی مٹی سے بھرائی میں میری مدد کی۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی ان کی اپنی تھی اور دوسری کی جب ضرورت پڑتی تو فوراً کہیں سے انتظام کر لیتے اور میری مشکل آسان کر دیتے۔ جب دکانوں پر لنٹر ڈالنے کا وقت آیا تو رمضان شریف کا مہینہ شروع ہو گیا۔ راجہ خان نے حوصلہ دیا اور ہم نے روزہ افطار کرنے کے بعد لنٹر ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ راجہ خان نے بجلی کا انتظام کیا اور ساری رات ہمارے ساتھ موجود رہے۔ راجہ خان کی کشش کی وجہ سے ہم تین چار سال تک اُن کی مشین والی جگہ پر محفل جماتے رہے۔ مہینے میں ایک بار راجہ خان ہم سب کی دعوت کرتے اور چکن کڑاہی کا اہتمام کرتے۔ وہ ہمارے قابل فخر دوست ہیں۔

حاجی صاحب بغداد خان بہت پرانے دوست ہیں۔ اُن دنوں حاجی صاحب نہیں تھے۔ زمینداری کرتے تھے اور خاص کر ٹماٹر کاشت کرنے کے بڑے شوقین تھے۔ سب دوست ان کی آرہٹ پر جاتے تھے اور گھنے درختوں کے سائے میں خوب گپ شپ لگاتے تھے اور بڑے خوش ہوتے تھے۔ ہم ہمیشہ انہیں اڈہ (بازار) لانے کی کوشش کرتے لیکن وہ ہنستے اور کہتے کہ ٹماٹر پک چکے ہیں ان کو توڑنا ہے آپ چلے جائیں اور مجھے رہنے دیں۔ ہم کہتے کہ آج ہمارے ساتھ بازار چلے جائیں کل ہم سب مل کر آپ کیساتھ ٹماٹر توڑیں گے۔ ایک دفعہ اتنے ٹماٹر ہوئے کہ ٹریکٹر ٹرالی میں بھر کر سواڑیٔ (بونیر) لے گئے تھے۔ بڑے خوبصورت دن تھے اور ہم دوستوں میں بہت محبت ہوتی تھی۔ بعد میں روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب چلے گئے اور وہاں سے حاجی صاحب بن کر واپس آئے۔ وہ ایک بہادر انسان ہیں اور دریا دل بھی۔ آج بھی میرے ساتھ بڑی محبت کرتے ہیں۔ ذہین اور نیک انسان ہیں۔ اصلاحی کمیٹی بابوزئی کاٹلنگ کے صدر رہ چکے ہیں اور آج بھی اس کے سرگرم رکن ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش اور آباد رکھے۔

آمین ۔

جن دوستوں کا ذکر اب تک کر چکا ہوں وہ تمام روشن ستاروں کی طرح ہیں ۔ جہاں ستاروں کا ذکر ہوگا وہاں چاند کا ذکر بھی لازماً ہوگا ۔ میرا اشارہ بخت بلند خان کی طرف ہے ۔ اللہ تعالٰی نے ان کو ایسی شخصیت سے نوازا ہے کہ جس محفل میں ہوتے ہیں اس کی رونق دوبالا بلکہ سہ بالا ہو جاتی ہے ۔ ان کے چہرے سے روحانی نور پھوٹتا ہوا نظر آتا ہے ۔ مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں ۔ چھوٹی عمر میں دین سے رغبت اور لگاؤ کی وجہ سے فریضۂ حج ادا کر چکے ہیں ۔ نہایت نیک انسان ہیں ۔ حرام خوری سے خود کو بچائے رکھتے ہیں ۔ حلال کمائی کی جستجو کرتے ہیں ۔ اللہ پر بھروسہ رکھنے والے انسان ہیں ۔ دریا دل اتنے کہ اکثر پروگراموں میں سب سے زیادہ پیسے دیتے ہیں ۔ دوستوں پر خرچ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں ۔ دوستوں کے ایک پروگرام میں مبلغ 2000 روپے دیئے جواب تک کسی دوست نے نہیں دیئے ہیں ۔ میرے ساتھ بے حد محبت کرتے ہیں ۔ مجھ پر ان کے بے شمار احسانات ہیں ۔ میرے لئے ہزاروں روپے خرچ کر چکے ہیں ۔ دوستوں کی محفل میں چودھویں کے چاند نظر آتے ہیں ۔ مجھے اور سارے دوستوں کو ان پر فخر ہے ۔ اللہ تعالٰی انہیں خوش اور آباد رکھے ۔ آمین ثم آمین ۔

ملک صاحب کی گرفتاری

۔۔۔۔۔اور بالآخر وہ پکڑے گئے۔ بکری کی ماں کب تک خیر مناتی۔ جہاں تک سوال مقابلہ کا تھا وہ ہم نے خوب ڈٹ کر کیا۔ پٹواری، گرد آور تحصیلدار، SHO، ASI اور دیگر بدخواہوں سے لڑے اور خوب لڑے۔ اس بات کا افسوس زیادہ ہے کہ ملک صاحب کو ذرا گرم سیزن میں یہ کمبخت لے گئے۔ ویسے دل کو ذرا اس بات سے تسلی ہو جاتی ہے کہ تحصیل کی حوالات نئی ہے جس میں پنکھا موجود ہے اور بالکل سامنے سڑک پر دکانیں ہیں جن سے برف مل سکتی ہے۔ گرم سیزن میں پنکھا ہو اور ٹھنڈا پانی ہو تو گزر آسان ہو سکتی ہے اور نئی تحصیل کے نئے حوالات میں یہ دونوں چیزیں چپڑاسی کو آٹھ دس روپیہ دے کر دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ملک صاحب میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو چپڑاسیوں کے ساتھ اُن کی ہمیشہ دوستی رہتی ہے۔ دراصل ملک صاحب غریب پرور انسان ہیں اور چپڑاسی چونکہ غریب ہوتا ہے ملک صاحب کا گرویدہ ہوتا ہے۔ ہم نے تحصیل کے جتنے چپڑاسی دیکھے ہیں سب کو ملک صاحب کا معترف پایا ہے۔ صرف حلقہ کاٹلنگ کے پٹواری کا بستہ بردار مسمی ملنگ ایسے شخص ہیں جو کہ ملک صاحب سے ہمیشہ ناراض رہتے ہیں۔ حالانکہ ملک صاحب ملنگ پر سب سے زیادہ شفقت فرماتے ہیں اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ ملنگ نااہل شخص ہیں ورنہ ملک صاحب کی غریب پروری میں کوئی کمی نہیں ہے۔

ملک صاحب کی غریب پروری کے کئی واقعات مشہور ہیں۔ ایک شخص نے ملک صاحب سے درخت خریدے۔ پیشگی مبلغ ایک ہزار روپیہ دے دیئے۔ بعد میں وہ شخص نقصان کے خوف سے سودا منسوخ کرنے ملک صاحب کے پاس آیا۔ ملک صاحب نے کمال مہربانی سے وہ زرِ پیشگی واپس کر دی۔ وہ غریب آدمی ملک صاحب کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ اور دوسرا واقعہ

تو بالکل قریب کا ہے۔فقیر گل خان اور گل فراز خان دونوں نے ملک صاحب کی کچھ اراضی کسی غریب شخص کے ہاتھ فروخت کرنا چاہی۔ یہاں تک کہ ملک صاحب نے بغیر رقم لئے اقرار نامہ بھی تحریر کر دیا۔ بعد میں اس شخص نے بوجہ غیر دستیابی رقم اراضی خریدنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ ملک صاحب نے کمال مہربانی سے اور غیر معمولی تحمل سے اس شخص کو معاف فرمایا۔ دیکھا آپ نے۔ کتنے غریب پرور ہیں ہمارے ملک صاحب۔ ہماری اس دنیا سے ملک صاحب جیسے غریب پرور انسان ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے اس گاؤں میں ملک صاحب جیسے اچھے انسان ہوتے تھے۔اب ان کم بختوں نے انہیں بھی حوالات میں بند کر دیا ہے۔اور دلبر خان جیسا بے رحم ،سنگدل اور غریب دشمن انسان کھلی فضاؤں میں آزادی کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ملک صاحب کے لئے بے ساختہ زبان پر یہ شعر یاد آ رہا ہے:

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے

میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

لیکن یہ قید کرنے والے بڑے ظالم اور سنگدل ہوتے ہیں۔ہم نے قید کرنے والے سے کہا۔ کہ ہم ملک صاحب کی ضمانت دیتے ہیں اس سنگ دل نے کہا کسی قسم کی ضمانت قبول نہیں جاؤ اور 44000 روپیہ لاؤ۔ہم نے کہا جی وہ رقم تو لوگوں کے ذمہ ہے۔اس نے کہا تو لوگوں سے بعد میں وصول کر کے خود لے لو اور اب 44000 روپے لا کر ہمیں دے دو۔ جب اس ظالم شخص نے ہم سے مسلسل 44000 روپے کا مطالبہ کیا تو میں نے فقیر گل خان کی طرف دیکھا اور انہوں نے گل فراز خان کی طرف' میں اِس ظالم شخص کے دفتر سے آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر نکل آیا۔ پیچھے دیکھا تو فقیر گل خان اور گل فراز خان بھی باہر آ رہے تھے۔سامنے دلبر خان کھڑا تھا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ملک صاحب کی ضمانت منظور ہوئی۔ میں بولا وہ ظالم 44000 روپے مانگ رہا ہے۔ دلبر خان کہنے لگا ملک صاحب تو حوالات میں خوش ہیں میں نے پوچھا تم ملے تھے۔ دلبر خان نے اثبات میں جواب دیا۔ ہم بھی ملک صاحب سے ملنے نئے حوالات چلے

گئے۔ علیک سلیک کے بعد دیکھا۔ حوالات میں پنکھا چل رہا ہے اور ٹھنڈے پانی کی بالٹی اور گلاس پڑا ہوا ہے۔ ہم نے ملک صاحب کو تسلی دی۔ اُنہیں کہا کہ تحصیلدار کے لئے ایک سفارشی لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کل تک آپ کا کام ہو جائے گا۔ ملک صاحب گویا ہوئے۔ سفارشی کو ذرا جلدی پہنچا دو۔ اگر آج کام ہو جائے تو بہتر ہو گا۔ ہم نے کہا بھرپور کوشش کر در ہے ہیں۔ آپ زیادہ فکر نہ کریں۔ ملک صاحب سے رخصت لی اور تحصیل سے باہر نکل آئے۔

دلبر خان بڑے موڈ میں تھے خوش وخرم نظر آ رہے تھے بے وقوف کہیں کے۔ یہ نہیں سوچتے کہ ملک صاحب بیچارے کس حال میں ہیں۔ ایک دو دن بعد ملک صاحب سے پھر نئ حوالات میں ملاقات ہوئی۔ پہلے تو ہم نے نئے حوالات کی تعریف کی۔ بعد میں ملک صاحب سے کہا کہ ہماری کوشش کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ ہم نے ایکدوسرے شخص کو ڈھونڈا ہے۔ وہ تحصیل دار کا بڑا دوست ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر اس شخص کو تحصیلدار صاحب کے پاس لاتے ہیں۔ ملک صاحب نے کہا کہ تمہیں وہ شخص آج اپنے ساتھ تحصیلدار کے پاس لانا چاہیے تھا۔ ہم نے کہا۔ ہمارا خیال تھا کہ پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔ اچھا اب آپ اجازت دیجئے کہ اس شخص کو تحصیلدار کے پاس لے آئیں۔ ہم نے ملک صاحب سے کہا۔ آپ فکر نہ کریں ہم دو تین روز میں آپ کو نکالنے کی کوشش کریں گے۔ ملک صاحب افسردہ نظر آ رہے تھے اور یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کہہ رہے ہوں ''سب جھوٹ ہیں۔'' ویسے بظاہر ملک صاحب نے ہمیں جلدی کرنے کی تاکید کر دی اور واقعی ہمیں تحصیل سے نکلنے کی جلدی تھی۔

تحصیل سے باہر آئے سامنے والے ہوٹل میں چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گئے۔ ملک صاحب کی رہائی پر غور وحوض ہوتا رہا۔ فقیر گل خان چونکہ ہم میں زرخیز ذہن کے مالک ہیں۔ لہٰذا میں نے اُن سے ملک صاحب کی رہائی کے بارے میں طریقہ دریافت کرنا چاہا۔ کیونکہ ملک صاحب کو حوالات میں 5 دن ہو چکے تھے اور مجھے ملک صاحب کا وہاں مزید ٹھہرنا گوارا نہیں تھا۔

فقیر گل خان نے مجھ سے دریافت کیا۔ کہ کیا واقعی تم ملک صاحب کی رہائی چاہتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو فقیر گل خان کہنے لگے کہ کل بارہ بجے سے پہلے پہلے ملک صاحب حوالات سے باہر ہوں گے۔ میں نے طریقہ دریافت کرنا چاہا تو فقیر گل خان کہنے لگے۔ تم لوگ ملک صاحب کی رہائی چاہتے ہو یا کہ ان کی رہائی کے طریقے معلوم کرنا چاہتے ہو؟ لاچار میرے منہ سے نکلا ''ٹھیک ہے۔'' دو دن گزر گئے۔ فقیر گل خان کوشش بسیار کے بعد ملے۔ ملک صاحب کے متعلق پوچھا کہنے لگے حوالات میں ہی ہوں گے۔

نویں دن پھر ملاقات کے لئے چلے گئے۔ ملک صاحب بزرگوں کی طرح ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ حوالات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فروٹ وغیرہ دے کر ملک صاحب سے کہا کہ چونکہ کل اس حوالات میں آپ کا آخری دن ہے اس آخری دن کو اطمینان کے ساتھ گزار دیں۔ آپ کی پیشی D.C صاحب مردان کے ساتھ ہوگی۔ وہاں ہم آپ کو چھڑانے کی حتی المقدور کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں اپنی کوششوں میں کامیابی یقینی نظر آ رہی ہے۔ کیونکہ D.C صاحب کا بھائی ہمارا پکا دوست بن گیا ہے۔ انہوں نے ہمیں آپ کو چھڑانے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ ملک صاحب کی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک پیدا ہوگئی اور ہمیں D.C صاحب کے بھائی کو بہت مجبور کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ فرماتے رہے کہ D.C صاحب کے بھائی سے کہنا کہ یہ کام بہت ضروری ہے اور اس کام کو ضرور بضرور کریں۔ ہم نے ملک صاحب کو یقین دلایا کہ ہمارا دوست بڑا پکا ہوتا ہے۔ ہم D.C کے بھائی کو کیا مجبور کریں گے اُلٹا D.C صاحب کا بھائی ہم سے مجبور ہے وہ از خود اتنی کوشش کرے گا اور آپ کو چھڑائے گا۔ تاکہ ہم ان کے زیرِ احسان ہوسکیں۔ ہم نے ملک صاحب سے کہا کہ ہم نے D.C صاحب کے بھائی کو وقت دے دیا ہے۔ لہٰذا ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ ملک صاحب چونکہ مشکل میں تھے اور ہماری موجودگی کو اپنے لئے بڑا سہارا سمجھتے تھے۔ بہ امرِ مجبوری ہمیں جانے کی اجازت عنایت فرمادی۔

ہوٹل میں آ کر ہم بیٹھ گئے اور ملک صاحب کی رہائی کے طریقوں پر سوچ بچار کرتے رہے۔ فقیر گل خان سے پھر کہا ''بڑے آئے ہو تجاویز پیش کرنے والے۔ کیا اس وقت کوئی ایسی تجویز پیش کر سکتے ہو جس سے ملک صاحب کی رہائی ممکن ہو سکے۔'' فقیر گل خان بڑی ڈھٹائی سے بولے۔ ''ایک تجویز کی بجائے دس تجاویز پیش کر سکتا ہوں عمل کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔'' میں نے ان سے پہلی تجویز پیش کرنے کو کہا۔ فقیر گل خان نے کہا۔ ''پرسوں ملک صاحب کی پیشی D.C صاحب کے ساتھ ہوگی۔ حوالات اور D.C سے دفتر کے درمیان قریباً آدھ میل کا فاصلہ ہے۔ تم اگر چاہو تو اس فاصلہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو۔'' تجویز چونکہ معقول تھی اور ہمارے پاس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کافی وقت تھا۔ لہٰذا ہم ہوٹل سے اُٹھ کر بعد میں کسی فارغ وقت میں تجویز پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ سکتے تھے ہم گاؤں چلے آئے۔ آرام کر کے سہ پہر کے وقت اکھٹے بیٹھ گئے۔ تجویز پر عمل کرنے کی ایک سکیم یہ تھی کہ کسی غنڈہ بدمعاش کی خدمات حاصل کی جائیں۔ پرسوں جب ملک صاحب کو حوالات سے نکال کر D.C کے دفتر لے جایا جا رہا ہو تو غنڈہ طاقت کا استعمال کر کے ملک صاحب کو چھڑا لے گا کیونکہ ملک صاحب پولیس کی تحویل میں تو نہ تھے۔ صرف تحصیل کے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو چپڑاسیوں کی تحویل میں تھے۔ اور غنڈے کے لئے چپڑاسی کو دبانا اور ملک صاحب کو چھڑانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ ہاں اس تجویز میں دو نقائص موجود تھے پہلی بات تو یہ تھی کہ غنڈہ ہم سے کافی رقم طلب کرتا جس کو دینے کی ہم میں استطاعت ذرا کم تھی۔ اگر ہم غنڈے کے ساتھ زیادہ رقم پر سمجھوتہ کر لیتے اور بعد میں دھوکا کر کے اُن کو کم رقم مہیا کرتے تو غنڈے کے ساتھ ہماری دشمنی بن جاتی جو یقیناً اچھی بات نہ ہوتی۔ نیز سکیم میں دوسری بڑی خرابی یہ تھی کہ فرض کریں غنڈے نے طاقت استعمال کی۔ چپڑاسی یا چپڑاسیوں کو دبایا ملک صاحب کو چھڑایا۔ ظاہر بات ہے غنڈہ تو فرار ہو جائے گا۔ دونوں چپڑاسی تحصیلدار کے پاس جائیں گے تحصیل دار پولیس سٹیشن سے رجوع کرے گا۔ ممکن ہے تحصیلدار صاحب کا ذہن فقیر گل خان سے زیادہ زرخیز ہو اور وہ چپڑاسیوں سے کہے کہ

پولیس میں رپورٹ درج کراتے وقت ملک صاحب کو بزور چھڑانے کا مقدمہ ایک شخص کی بجائے چھ سات آدمیوں کے خلاف درج کیا جائے جائے۔ چپڑاسی لوگ یقیناً ایسا ہی کریں گے۔ بعد میں دوران تفتیش ہمارا پکڑا جانا ممکن بلکہ یقینی ہوسکتا ہے کیونکہ اگر کسی پولیس آفیسر نے تھوڑی سی پوچھ گچھ کی تو پارٹی کے باقی ممبران تو ایک گھنٹہ دو گھنٹہ مزاحمت کرسکیں گے لیکن دلبر خان کے لئے دومنٹ تک بھی پولیس کی مزاحمت ممکن نہ رہتی اور دلبر خان ساری بات پولیس کو بتا دیتے۔

پہلی سکیم کو خطرناک قرار دے کر دوسری سکیم زیرغور لائے۔ دوسری سکیم میں سب سے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ ہم بذاتِ خود محفوظ تھے۔ سکیم یہ تھی کہ چپڑاسیوں کو رقم کی لالچ دے کر ملک صاحب کی رہائی میں ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔ چپڑاسی لوگ یہ کام زیادہ سے زیادہ دو چار سو روپوں میں کرنے پر راضی ہو سکتے تھے کیونکہ چپڑاسی لوگوں کا پیٹ چھوٹا ہوتا ہے اگر چہ ان لوگوں کی زبانیں دراز ہوتی ہیں۔ مثلاً چپڑاسی سے اس کام کے معاوضے کے متعلق پوچھا جائے تو وہ سوا ایک سو بیس روپیہ معاوضہ بنائے گا۔ بعد میں وہ بڑی خوشی کے ساتھ اس کام کے معاوضے کے طور پر دس پندرہ روپے میں راضی ہوجائے گا۔ ہم نے ملک صاحب کی رہائی کے لئے تحصیل کے چپڑاسیوں سے بات کی تو انہوں نے مبلغ دو ہزار روپیہ معاوضہ طلب کیا بعد میں دونوں چپڑاسی ڈھائی سو روپیہ پر راضی ہوئے۔ ہم نے مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی دے دیا اگر چہ وہ کل رقم ادا کرنے پر اصرار کرتے رہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر چپڑاسی ملک صاحب کو رہائی دلانے میں کامیاب ہوں گے تو چپڑاسیوں کو باقی ماندہ رقم مبلغ 150 روپے ادا کرنے سے انکاری ہو جائیں گے۔ دوسری طرف چپڑاسی حضرات ہم سے زیادہ سے زیادہ زرپیشگی وصول کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چپڑاسی بہت جہاں دیدہ گرگ قسم کے چپڑاسی تھے۔ بمشکل مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی لینے پر راضی ہوئے۔

ہم سب ملک صاحب کی رہائی کے لئے بے تاب تھے۔ ہمیں یقین دہانی کرانے کے

لئے وہ چرب زبانی سے کام لے رہے تھے دونوں چپڑاسیوں کی زبانیں قینچیوں کی طرح چل رہی تھیں اور ہم خوش ہو رہے تھے کہ ملک صاحب کی رہائی ایک قلیل رقم کے عوض ہونے والی ہے۔

ابھی D.C صاحب گھر سے دفتر تشریف نہیں لائے تھے ہم لوگ سالار ہوٹل ایک کپ چائے پینے کے لئے چلے گئے۔ ملک صاحب اور چپڑاسیوں کے لئے D.C صاحب کے بنگلہ میں چائے بھجوائی۔ چائے پینے کے بعد ہم لوگ ہوٹل میں گپ شپ میں مشغول رہے کہ اتنے میں دلبر خان جس کی ہمیشہ باہر گھومنے کی عادت ہے۔ ہوٹل کے اندر آئے اور گویا ہوئے۔'' ملک صاحب سبز علی خان کو دونوں چپڑاسی جیل کی طرف لے جا رہے ہیں۔'' ہم سب بدحواسی میں کرسیوں سے اُٹھے۔ ہوٹل سے باہر آئے دیکھا ملک صاحب چپڑاسیوں کی تحویل میں بہ طرف جیل خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔ میں نے لپک کر سڑک پار کی اور جلدی میں ایک چپڑاسی سے احوال دریافت کرنا چاہا۔ چپڑاسی نے مجھے آنکھ ماری اور ان سے پرے رہنے کی تاکید کی اور ساتھ ہی مسکراتے رہے۔ میں سمجھا کام ہونے کو ہے۔ ملک صاحب رہا ہونے والے ہیں۔ میں نے تصور میں ٹیکسی حاصل کی۔ ملک صاحب کو ٹیکسی میں بٹھایا اور ٹیکسی ہوا سے باتیں کرتی ہوئی منٹوں، سیکنڈوں میں کاٹلنگ پہنچے گی لیکن وائے ناکامی! جب چپڑاسیوں نے ملک صاحب کو مین روڈ سے جیل کی طرف موڑا تو ہمارے ناتواں جسموں سے سانس نکلتی محسوس ہونے لگی۔ یوں تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ملک صاحب کی آخری آرام گاہ جیل ہی ہے لیکن ایک موہوم سی امید یہ تھی کہ ممکن ہے چپڑاسی لوگ ملک صاحب کو جیل کے نزدیک وکیلوں کی کچہری میں فرار کا موقع دینا چاہتے ہوں۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر چپڑاسی ملک صاحب کی رہائی کا وعدہ پورا کرنے میں مخلص ثابت ہوئے تو ان کو باقی ماندہ مبلغ 150 روپے ضرور ادا کروں گا اور ساتھ ہی ساتھ مبلغ 50 روپے انعام ان چپڑاسیوں کو اور دوں گا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تا کہ میرا فاصلہ ان سے کم سے کم رہے اور ملک صاحب فرار کی صورت میں میری نظروں کے سامنے

رہیں۔ ظالم چپڑاسیوں نے ملک صاحب کے گرد اپنا گھیرا اور تنگ کر دیا اور ملک صاحب کو رفتار تیز کرنے میں مدد دینے لگے۔ ملک صاحب نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھیں شدتِ غم سے نمناک تھیں اور جیسے ہم سب سے شکوہ کر رہی تھیں۔ ''تمہاری دوستی پر مجھے کتنا ناز تھا لیکن تم میری کوئی مدد نہ کر سکے'' میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کوشش کے باوجود مجھے ملک صاحب اور چپڑاسی نظر نہیں آ رہے تھے۔ لاچار میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد پارٹی کے دیگر ارکان پہنچ گئے میری ہچکی بندھ گئی۔ جیل کی دیوار سے پیٹھ لگا کر میں بیٹھ گیا اور زار و قطار رونے لگا۔ سب پارٹی والے رو رہے تھے رونے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ دلبر خان مگرمچھ والے آنسو بہا رہے تھے۔ اس روز راجہ خان سے بڑی محبت پیدا ہوئی۔ سب سے زیادہ زار و قطار وہی رو رہے تھے۔ فقیر گل خان اگر چہ رونے کی ایکٹنگ کر رہے تھے لیکن ان کے چہرے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کوئی خاص خفہ نہیں ہیں۔ باقی سب لوگ ملک صاحب کی جدائی کی وجہ سے نڈھال تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نجانے کتنے عرصے بعد ملک صاحب کا دیدار نصیب ہوگا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے زور زور سے کوئی ہلا رہا ہے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میری سب سے چھوٹی بچی میرے سامنے کھڑی اور کہہ رہی ہے۔ ''ابو! آپ تو نیند میں رو رہے ہیں کیا کوئی برا خواب دیکھ لیا'' میں جلدی سے اُٹھا اس کو گلے لگایا اور تسلی دی کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ساتھ ہی میں نے سکھ کا ایک لمبا سانس لیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ سب حقیقت میں ایک ڈراؤنا خواب ہی تھا۔

مقناطیسی کشش

نہ جانے کیا بات ہے ملک صاحب سبز علی خان بے حد یاد آ رہے ہیں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو خود کو منوا کر رہتی ہیں۔ کوشش کے باوجود بھلائے نہیں بھولتیں۔ دراصل ایسی شخصیتوں میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ اور مقناطیس کی تو خاصیت ہوتی ہے کہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچے۔ ملک صاحب عظیم شخصیت کے مالک ہیں اور عظیم مقناطیسی کشش رکھتے ہیں تو ہمارا دھیان اُن کی طرف کھینچے چلا جانا قدرتی امر ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار ملک صاحب کی مقناطیسی قوت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو ہمیں ان سے نفرت سی ہو جاتی ہے لیکن وہ مرحلہ عارضی ثابت ہوتا ہے۔ ہاں حیرانی کی بات یہ ہے کہ دلبر خان پر ملک صاحب کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں یا تو دلبر خان میں فولادی خاصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے ملک صاحب کی مقناطیسی قوت انہیں اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی اور یا دلبر خان کی شخصیت بجائے خود مقناطیسی ہے۔ اُس صورت میں تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ ایک مقناطیس دوسرے مقناطیس کو اپنی طرف کھینچنے کی بجائے پرے دھکیلتا ہے۔ یہ تو ایک عام سائنسی اصول ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے دلبر خان اور ملک صاحب کے درمیان کشش کا فیصلہ تو میں پارٹی پر چھوڑتا ہوں ہاں اپنی رائے کا اظہار ضرور کروں گا۔

دیکھئے نا! ادھر بالا خانہ میں ایک مہمان بات کر رہا تھا ملک صاحب اور دلبر خان بھی تشریف فرما تھے بیچ میں دلبر خان نے بات کہہ دی ملک صاحب نے اُنہیں سختی سے ٹوکا۔ دلبر خان نے پوری قوت سے ملک صاحب کو ''چُپ'' کہا۔ ملک صاحب نے شیر کی طرح دھاڑ کر دلبر خان کو ڈانٹ پلائی۔ دونوں اطراف سے گالم گلوچ کا تبادلہ ہوا اور دونوں میں لڑائی بلکہ بھرپور لڑائی

شروع ہوئی۔ اتنا شور کے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور اس دوران فقیر گل خان مسلسل کھڑکی کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے میں اکیلا دلبر خان اور ملک صاحب کے درمیان دیوار بنا کھڑا رہا اور راجہ خان بادل ناخواستہ دونوں مقناطیسوں کی چھڑائی میں میری مدد کرتے رہے۔ ملک صاحب جوکہ بے حد جلال میں تھے ایک ہاتھ سے اپنا ازار بند پکڑے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ کو استعمال کرنے کی بجائے زبان کی پوری طاقت استعمال کررہے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ بازار کے دکانداروں کی قطار اوپر بالا خانہ میں لگ گئی۔ ایک دکاندار مظفر خان جب اندر داخل ہوا اور انہوں نے دیکھا کہ ہر طرح سے خیر خیریت ہے کوئی خون خرابہ نہیں ہے تو کہنے لگا۔ ''بھئی! ہم تو سمجھے تھے کہ آپ لوگوں نے ملک صاحب کو مشترکہ طور پر گھیر کر مارنا شروع کردیا ہے اور ملک صاحب ضربات کی شدت کی وجہ سے دھاڑ رہے ہیں۔ یہاں تو سب خیر خیریت ہے۔'' ہم نے مظفر خان دکاندار کو رخصت کیا اور دیگر دکاندار بھی نیچے چلے گئے۔ بعد میں میں نے فقیر گل خان سے پوچھا کہ آپ کیوں لڑائی کے دوران کھڑکی کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ دراصل وہ چاہتا تھا کہ کھڑکی کی کھٹکھٹاہٹ کی وجہ سے ملک صاحب کا شور باہر بازار تک نہ جائے اور جب ملک صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کیوں لڑائی کے دوران ایک ہاتھ سے ازار بند پکڑ رکھا تھا تو ملک صاحب کہنے لگے کہ زیادہ غصے کی وجہ سے اُن کا پاجامہ نیچے گر رہا تھا۔ بعد میں راجہ خان نے کمال مہربانی کر کے مبلغ دس روپے کا عطیہ پیش کیا اور مبلغ پانچ روپے ملک صاحب نے اور مبلغ پانچ روپے دلبر خان نے پیش کئے۔ اس طرح مبلغ بیس روپے کی چائے اور بسکٹ کا خرچہ کر کے دلبر خان اور ملک صاحب میں صلح کرادی گئی۔

الپاکستانی خُرمہ خورد

اب تک تو ہمارا یہی خیال تھا کہ دلبر خان تعلیم یافتہ اور مدبر قسم کے انسان ہیں اگر چہ بعض دوست برابر اس خیال کی صداقت کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے لیکن اب یہ بات صاف ہوتی جا رہی ہے کہ دلبر خان واقعی تدبر سے عاری ہیں اور احسان فراموش بھی۔ جتنی دلبر خان کی قدر کی جائے اتنی ہی وہ بدلحاظی کا مظاہرہ کرتا ہے اگر کوئی انہیں نصیحت کر کے سمجھاتا ہے تو اُلٹا غصہ میں آ جاتا ہے وہ خود کو بڑا تیس مار خان سمجھتا ہے۔ دیکھئے ناں! ایک دفعہ کہہ رہا تھا کہ وہ اور سعید شاہ خان گاؤں سے براستہ تھانہ اڈہ جا رہے تھے جب پختہ سڑک پر پہنچے تو سعید شاہ خان سڑک پر ایبز رگی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دلبر خان کہتا ہے کہ اس نے سعید شاہ خان سے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو سعید شاہ خان بولا اڈہ کی طرف۔ جس پر بقول دلبر خان انہوں نے سعید شاہ خان کو بازو سے پکڑ کر اس کا منہ سڑک کی دوسری جانب موڑ دیا کہ اڈہ اس طرف ہے۔ گویا دلبر خان ہمیں بتانا چاہتے ہیں کہ سعید شاہ خان کو کاٹلنگ اڈہ معلوم نہیں تھا اور یہ دلبر خان تھے جو انہیں پہلی دفعہ اڈہ لے گئے تھے۔

دلبر خان کو اپنی تعریفیں کرنے کا بہت شوق ہے اور وہ اکثر اوقات اپنی بہادری کے واقعات سناتے رہتے ہیں۔ مثلاً اپنے ایران کے دنوں کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جہاں وہ مزدوری کے لئے گئے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ ایک مستری ان کی کسی بات پر اُن پر غصہ ہوئے اور فارسی زبان میں غالباً کچھ نازیبا الفاظ بھی کہے۔ دلبر خان نے بقول اُن کے اس کو ایسا مارا کہ وہ وہاں سے اپنے قریب رکھے ہوئے سامان کی طرف بھاگا۔ دلبر خان کو تشویش ہوئی کہ وہ پستول یا چاقو نکالنے والا ہے لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ اُن کے ہاتھ میں کھجوریں تھیں اور وہ چاپلوسانہ

انداز میں دلبر خان سے کہنے لگے۔''الباکستانی خُرمہ خورد'' یعنی پاکستانی کھجوریں کھائیں۔اس کے بعدان پر دلبر خان کی ایسی دھاگ بیٹھ گئی کہ وہ اُن کا خصوصی خیال رکھنے لگے۔

اگر چہ ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ آزاد ذرائع سے اس واقعہ کی تصدیق کرسکیں لیکن چونکہ دلبر خان بیان کرر ہے ہیں تو ہم اس کو مان لیتے ہیں لیکن اکثر دوست کہتے رہتے ہیں کہ ان کا موجودہ رویہ اس واقعے سے میل نہیں کھاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ دلبر خان بہادری کے دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن جب کوئی کڑا وقت آتا ہے تو وہ بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔

بعض دوست فقیر گل خان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ دلبر خان ان کی دریافت ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فقیر گل خان سے پہلے تو غلطی نہیں ہوتی لیکن جب ہو جاتی ہے تو کوہِ ہمالیہ جتنی بڑی ہوتی ہے۔ٹھیک ہے ملک صاحب سبز علی سے تھوڑی غلطی سرزد ہوئی ہوگئی لیکن فقیر گل خان نے ان کو اتنی سزادی کہ دلبر خان کو پارٹی پر مسلط کر دیا۔

تحریر کی بندش

میرا خیال ہے کہ میں مضمون نویسی چھوڑ دوں۔ دیکھئے ناں! اگر آپ سچی بات لکھ دیں تو لوگ خفا ہو جاتے ہیں مثلاً دلبر خان کو لیجئے آخر دلبر خان میں کونسی صفت ہے جسے زیرِ تحریر لایا جائے۔ ہاں اگر دلبر خان کی واقعی کمزوریوں کو تحریر میں لاؤں اور دلبر خان کو معلوم ہو جائے تو میرا دشمن بن جائے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سارا سارا دن دلبر خان فضول پھرتا رہتا ہے لیکن یہی حقیقت اگر آپ نوکِ قلم پر لاتے ہیں تو دلبر خان کے دشمن بن جاتے ہیں۔

چلئے دلبر خان کو چھوڑیئے ملک صاحب سبز علی خان کو لے لیجئے۔ بیماری یا یونہی جس دن ان کا پرہیز ہوتا ہے وہ کھانے کے لئے کسی اور کے گھر کا رخ کرتے ہیں کسی طبیب یا نیم ڈاکٹر قسم کے شخص نے ملک صاحب سے کہا کہ آپ کھانے میں دودھ استعمال کریں۔ مسلسل دو رات فقیر گل خان اور گل فراز خان کے ہاں گئے اور کھانے میں دودھ تناول فرمایا۔ تیسری رات پھر گئے اور کھانے میں دودھ کی فرمائش کی۔ دونوں نے انکار کیا اور ملک صاحب سے عرض کیا کہ برائے کرم اب معاف بھی کر دیجئے۔ ملک صاحب ناراض ہوئے کہنے لگے۔ ''دیکھو! میں تم دونوں کے لئے ہر کام کرتا ہوں یہاں تک کہ تمہارے مخالف پر بندوق سے فائر کر سکتا ہوں اور تم میرے لئے کھانے میں دودھ نہیں لا سکتے۔'' ظاہر ہے فقیر گل خان اور گل فراز خان پر ملک صاحب کی باتوں کا آخر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ معز اللہ خان نامی ایک شریف انسان وہاں تشریف فرما تھے ان کی والدہ صاحبہ نے صبح کے چائے کے لئے قریباً آدھ سیر دودھ خریدا تھا معز اللہ خان نے ایک پاؤ دودھ اور خرید کر یا مانگ کر صبح چائے کے لئے رکھے ہوئے دودھ میں ملایا اور تین پاؤ دودھ برتن میں بھر کر دو روٹیوں کے ہمراہ ملک صاحب کو

پیش کر دیا۔ ملک صاحب نے خوب سیر ہو کر کھایا اور گھر تشریف لے گئے اب ملک صاحب کو کون کہے کہ جب آپ کا پرہیزی کھانا شروع ہو جاتا ہے تو گھر تشریف لے جایا کریں۔

جب کبھی میں دلبر خان یا ملک صاحب کے سامنے سچ بولتا ہوں تو دونوں مجھ سے عموماً ناراض ہو جاتے ہیں۔ دونوں کی آپس میں کوئی محبت نہیں اور دونوں کبھی ایک بات پر متفق بھی نہیں ہوتے سوائے اس بات کے کہ دونوں میری مخالفت پر متفق ہیں۔

میرا بلکہ ہمارا ایک دوست ہے جن کا نام عبدالکریم ہے۔ میاں خان کا رہنے والا ہے شریف اور سیدھا سادہ انسان ہے کسی دن میلہ میں دلبر خان سے ملاقات ہوگئی دلبر خان نے اپنا گھر دکھایا اور ساتھ کہہ دیا کہ اگر ضرورت ہو تو یہاں تشریف آوری کر سکتے ہو۔ ایک دن عبدالکریم سہ پہر کے وقت آیا۔ مجھے تلاش کیا لیکن میں نہ ملا۔ فقیر گل خان کی جستجو کی مگر ناکام رہا۔ معاً خیال آیا کہ کیوں نہ آج دلبر خان کے ہاں رات گزاری جائے۔ وہاں چلا دلبر خان ہمیشہ کی طرح موجود نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد یعنی مغرب کے وقت پھر ان کے گھر کا چکر لگایا۔ دلبر خان ہوتے تو گھر سے نکلتے؟ لاچار واپس آ رہا تھا کہ راجہ خان کی مشین کے سامنے سے گزرا میں وہاں بیٹھا ہوا تھا آواز دی، وہ آیا میں نے پوچھا کدھر سے آ رہے ہو؟ کہنے لگا دلبر خان کے ہاں گیا تھا میں نے کہا کیا دلبر خان اس وقت گھر پر ہوتے ہیں؟ کہنے لگا دو دفعہ گیا پر نہیں ملا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ یوں نہیں جایا کرتے۔ کہنے لگا دلبر خان نے خود کہا تھا کہ یہ میرا گھر ہے جب بھی ضرورت ہو آ جایا کرو۔ میں نے کہا کہ بھائی اگر ورزش کرنے کو جی چاہ رہا ہو تو جایا کرو ورنہ دلبر خان صبح سویرے گھر پر ہوتے ہیں پھر نکل جاتے ہیں۔ بارہ ایک بجے دوپہر گھر پر ہوتے ہیں پھر نکل جاتے ہیں پھر رات نو دس بجے گھر پر ہوتے ہیں۔ اگر ان اوقات میں ملاقات کے لئے جا سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ تکلیف مت کرو۔ جب دلبر خان سے عبدالکریم کا ذکر کیا تو غصہ میں آ گئے میں چپ رہا ورنہ ان سے کہنا چاہیے تھا کہ ناحق مسافروں کو تکلیف نہیں دیا کرتے۔

اسی طرح پرسوں بالا خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ملک صاحب بھی تشریف فرما تھے۔

دو پہر کے کھانے کا وقت ہوا۔ ہم سب اُٹھے ملک صاحب فرمانے لگے کہ ان کا پیٹ خراب ہے۔ میں نے کہا ملک صاحب ایک پاؤ دودھ کے ساتھ ایک روٹی کھالیں ۔ ملک صاحب جلال میں آ گئے ۔''کہاں سے دودھ کے ساتھ روٹی کھاؤں'' میں نے آہستہ سے کہہ دیا۔عثمان خان ہوٹل والے سے ایک روپیہ کا دودھ اور ولی محمد ہوٹل والے سے آٹھ آنے کی روٹی خرید کر کھالیں ۔ ملک صاحب چپ تو ہوئے لیکن قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتے رہے اور میں اپنی بات پر پشیمانی محسوس کرتا رہا۔

دوسرے دن پھر بالا خانہ پر تشریف لائے کہنے لگے پیٹ میں درد محسوس ہو رہا ہے میں نے کوکا کولا تجویز کیا۔ کہنے لگے ''کدھر ہے'' اس سے پہلے چونکہ ملک صاحب مجھ سے ناراض ہو چکے تھے ۔ چنانچہ پانچ روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر کوکا کولا کا آرڈر دینے والا تھا کہ ایک روپیہ کا نوٹ راجہ خان نے پیش کیا۔ کہ ملک صاحب کے لئے ایک کی بجائے دو بوتل ہو جائے ۔ حاجی عبدالکریم دکاندار کے نوکر کو چھ روپیہ دیئے اور دو بوتل کوک کے منگوائے اتفاقاً سلیم خان آف جمال گڑھی اور گل سید شاہ خان ٹیلیفون بابو تشریف لائے ۔ ایک بوتل ملک صاحب نوش کر گئے اور مسرور ہوئے ۔ دوسری بوتل سلیم خان اور گل سید شاہ خان باری باری پیتے رہے۔

ایک دفعہ علی اکبر خان آف شیوہ باڈہ نے ملک صاحب کے لئے دو پہر کے کھانے میں بھنڈی کے ساتھ جام بھر دودھ پیش کیا۔ ملک صاحب نے روٹی بھنڈی کے ساتھ تناول فرمائی ۔ اور دودھ سے بھرا ہوا جام پانی سمجھ کر نوش فرمایا۔ اب بھنڈی کم بخت ایک ایسی عجیب خاصیت رکھتی ہے کہ اس کے کھانے کے بعد اگر دودھ پیا جائے تو بھنڈی کے دانے بندوق کے چھرے بن کر معدہ کے اوپر گولہ باری شروع کر دیتے ہیں ۔ ملک صاحب کے ساتھ ایسا ہی ہوا ملک صاحب مارے درد کی شدت کے چارپائی پر لوٹ پھوٹ ہو رہے تھے۔ علی اکبر خان بچارے کو ریڑھے میں بھینسا ڈال کر ملک صاحب کو ڈاکٹر محمد نثار خان کے پاس لانا پڑا۔ علی اکبر خان نے ملک صاحب کو تو کچھ نہ کہا۔ دوسرے دن سارا غصہ ہم پر نکالا۔

میں بھی کیا سادہ ہوں خان محمد علی خان آف ہوتی کے بھتیجے کی شادی تھی دلبر خان کو بھی ہمراہ لے گیا ایک پلیٹ دلبر خان کے لئے بھری دوسری اپنے لئے۔ لوگ تو کھڑے ہو کر کھا رہے تھے میں چمن کے ایک کونے میں بیٹھ کر کھانے لگا۔ دلبر خان بھی وہاں آ کر بیٹھ گیا دلبر خان کی پلیٹ کی طرف دیکھا پلیٹ گوشت سے خالی پڑی تھی۔ دلبر خان سے عرض کیا کہ کڑاہی میں گوشت پڑا ہوا ہے اپنے پلیٹ میں جا کر لے آؤ۔ کہنے لگا ''نہیں! میں نہیں کھاتا۔'' میں نے اپنی پلیٹ کا گوشت دلبر خان کے پلیٹ میں ڈالا اور اپنی پلیٹ جا کر گوشت سے بھر دی۔ پھر دیکھا دلبر خان کی پلیٹ گوشت سے خالی تھی۔ اپنی پلیٹ سے مزید گوشت دلبر خان کی پلیٹ میں منتقل کیا ایک دو نوالہ کھا کر جو دیکھا تو دلبر خان کی پلیٹ گوشت سے خالی تھی۔ اپنی پلیٹ کا سارا گوشت دلبر خان کی پلیٹ میں ڈال کر پھر اپنی خالی پلیٹ کو گوشت سے بھر دیا۔ دیکھا تو دلبر خان خالی چاول تناول فرما رہے تھے۔ میں اپنی بھری ہوئی پلیٹ سے گوشت دلبر خان کی پلیٹ میں منتقل کرتا رہا اور دلبر خان سیکنڈوں کے حساب سے گوشت سے شغل فرماتے رہے۔ میں بھی تھک کر بیٹھ گیا خان محمد علی خان صاحب کے ہاں ایک نوکر موضع جمال گڑھی کا رہنے والا ہے شمس زمان ان کا نام ہے۔ انہوں نے مجھے شست میں لیا ہوا تھا۔ جب کھانے کے بعد لان سے نکل رہا تھا تو تیزی سے آ کر میرے کان میں چپکے سے کہا۔ ''خان تم نے تو دس پلیٹ گوشت نوشِ جان کئے ہیں۔'' ''کہو تو قہوہ کا انتظام کروں''۔ میں تو مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ بعد میں دلبر خان سے کہا کہ بھائی۔ ایسی دعوتوں میں مہمان اپنی سروس خود کرتے ہیں۔ تمہیں چاہیے تھا کہ اپنی پلیٹ میں خود گوشت ڈالتے۔ کہنے لگا ''مجھے دراصل گوشت پسند نہیں ہے۔'' میں بولا دوسیر تو کھا چکے ہو کہنے لگا وہ تو تم نے دیا اور میں نے کھایا ورنہ مجھے گوشت پسند نہیں۔''

نور غلام خان کی والدہ صاحبہ مرحومہ کی قبر پختہ ہو رہی تھی دلبر خان اور ملک صاحب صبح سویرے گئے ہوئے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے بارش شروع ہو گئی۔ ہم بارش کی وجہ سے دس بجے وہاں پہنچے۔ فقیر گل خان گھر سے چائے اور نشاستہ کا حلوہ لایا ہوا تھا۔ ڈھیروں پراٹھے، حلوہ،

کیک پڑے ہوئے تھے۔حمید گل خان نے نشاستہ والاحلوہ میرے سامنے رکھا۔دلبر خان کی نظر پڑ گئی۔میرے اردگرد دیگر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔دلبر خان کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن دلبر خان نے کمال ڈھٹائی سے اپنے بیٹھنے کے لئے گنجائش نکال لی۔ایک دو آدمیوں کو بازوؤں سے دھکیلا اور بیٹھ گئے ٹھیک ہے کھانے کا شوق کسے نہیں ہوتا۔لیکن دلبر خان سے پوچھو۔تو صاف انکاری۔۔۔کہتے ہیں پراٹھا اسے پسند نہیں اور دو چار کھا لیتے ہیں۔کیک اُنہیں پسند نہیں اور ہڑپ کر جاتے ہیں حلوہ یعنی میٹھا اُنہیں پسند نہیں بیٹھنے کی گنجائش نہ ہونے کے باوجود گنجائش نکال لیتے ہیں۔اب میرے لئے صرف ایک راستہ باقی رہ گیا ہے کہ خاموش رہوں۔اور لکھنا بھی بند کر دوں۔آج سے میں نے مزید لکھنا بند کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔اگر پارٹی کے کسی فرد نے مجبور نہ کیا تو کاپی کے یہ باقی صفحے خالی پڑے رہیں گے۔

ہنگامی اجلاس

۱۶۔۵۔۱۹۸۵ء

آج بسلسلۂ تحریر حالات زندگی ملک صاحب سبز علی خان و دلبر خان جو بندش ہوئی تھی۔متفقہ طور پر مندرجہ ذیل ممبران نے فیصلہ کیا کہ اس دستاویز کی تحریر جاری رہے۔

۱۔ فقیر گل ۲۔ گل فراز خان ۳۔ شیر محمد خان

۴۔ حمید گل ۵۔ فضل خالق خان ۶۔ شاکر خان

دوبارہ لکھنے کا فیصلہ چونکہ پارٹی کا فیصلہ ہے اس واسطے انکار ممکن نہیں ہے اور لکھنے میں اب میرا قلم آزاد ہے۔جس کے متعلق لکھوں حتیٰ کہ جنہوں نے اجازت دی ہے اگر ان کے متعلق لکھوں تو بھی کوئی پابندی تسلیم نہیں کروں گا اور نہ موردِ الزام ٹھہرایا جاؤں گا۔لکھنے کی اجازت ایسی تو نہیں ہوتی کہ لکھنے والا کسی اور کی مرضی کے مطابق لکھے۔اجازت کے معنی میں آزاد لکھنے کو کہتا ہوں۔ایسا وقت آئے گا اور ضرور آئے گا کہ میں فقیر گل خان،گل فراز خان،شیر خان،حمید

گل خان وغیرہ کے متعلق لکھنا شروع کروں گا اور مندرجہ بالا پارٹی ارکان کو میرا لکھا ہوا خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہوگا۔ ہاں یہ بات ہے کہ اگر پارٹی میں کوئی ممبر میرے متعلق لکھے تو مجھے اعتراض نہ ہوگا دراصل کسی پارٹی ممبر کے متعلق لکھنا اس کی اصلاح کی غرض سے ہوتا ہے اور اصلاح سے بڑھ کر اچھائی کا کام آخر کیا ہوسکتا ہے؟

......☆......

نظر کا تیر

دلبر خان کو پارٹی کی ناک کہوں یا پارٹی کی دم ۔ جب بھی ہم کسی کام کے لئے جاتے ہیں دلبر خان پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں ۔ اگر تفریح کی غرض سے روڈ پر یا راستہ پر ٹہلنے کے لئے نکل پڑتے ہیں تو دلبر خان سب سے پیچھے بلکہ بہت پیچھے رواں دواں نظر آتے ہیں ۔ جب بازار میں چلتے ہیں تو دلبر خان پیچھے ہی ہوں گے ۔ یہ پیچھے چلنے کا راز دلبر خان نے کسی کو نہیں بتایا۔ گاؤں میں تو خیر گزارہ ہو جاتا ہے لیکن بازار میں حد درجہ تکلیف دہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ بازار میں لوگوں کی بھیڑ ہوتی ہے ہر شخص راستہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ آگے بڑھ سکے ہم خود بازار میں یہی کرتے ہیں ۔ جب بھی پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں دلبر خان غائب ہوتے ہیں ۔ اب یا تو آگے بڑھنا چاہیے یا انتظار کرنا چاہیے تاکہ دلبر خان وہاں پہنچ سکیں ۔ بسا اوقات انتظار کی یہ گھڑی کافی طویل بھی ہو جاتی ہے ۔ تجربہ بتاتا ہے اگر آپ دلبر خان کے ہمراہ بازار میں ہیں تو ہر تین چار قدم کے بعد مڑ کر آپ کو دلبر خان کے اوپر نگاہ رکھنی پڑے گی ورنہ لاپرواہی کی صورت میں دلبر خان غائب ہوں گے اور آپ کو انہیں ڈھونڈنے کے لئے کافی وقت صرف کرنا پڑے گا ۔

ایک عام شخص بازار میں جو فاصلہ پانچ منٹ میں طے کرتا ہے کوئی بھی شخص وہی فاصلہ دلبر خان کے ہمراہ ہو کر ایک گھنٹہ میں طے کرے گا ۔ ہمارا جب کام ضروری ہوتا ہے اور ہمیں وقت کی بچت درکار ہوتی ہے تو ہم دلبر خان کو ہمراہ نہیں لیتے ۔ بعد میں جب ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ پارٹی کے لوگ بغیر ان کے بازار گئے ہوئے ہیں تو ناراض ہو جاتے ہیں اور پارٹی کے خلاف باتیں شروع کر دیتے ہیں ۔

مثالیں تو کئی ایک ہیں ۔ ایک مثال لکھ دیتا ہوں ۔گل فراز خان نے والد صاحب کو ہسپتال میں داخل کرایا۔ رات کو ہم نے فیصلہ کیا کہ کل مردان جائیں گے ۔ فیصلہ میں دلبر خان بھی موجود تھے ۔ میں ،فقیر گل خان ، راجہ خان اور شیر خان بس میں بیٹھ گئے ۔ جمعہ کا دن تھا جب بس اس جگہ پہنچی جہاں پر میلہ کا انعقاد ہوتا ہے تو دیکھا دلبر خان مرغیوں والی جگہ کے نزدیک سڑک کے شرقی کنارے پر کھڑے تھے ۔ چونکہ چہرے سے لاپرواہی ٹپکتی تھی ۔ ہم نے بھی کوئی توجہ نہیں دی ۔فقیر گل خان نے کہا بھی کہ دلبر خان کھڑے ہیں میں نے دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیرلیا تھوڑی دیر کے بعد بس روانہ ہوئی ہم ہسپتال گئے ۔گل فراز خان کے والد کو دیکھا اس کے بعد کئی دفعہ گئے مگر دلبر خان ایک بار بھی نہیں گئے ۔ دراصل دلبر خان چاہتے تھے کہ اس روز جب ہم بس میں بیٹھے ہوئے تھے ہم میں سے ایک شخص کو نیچے اتر کر دلبر خان سے کہنا چاہیے تھا'' آؤ دلبر خان گل فراز خان کے والد صاحب کی مزاج پرسی کے لئے ہسپتال چلتے ہیں ۔'' اور جواباً دلبر خان لاپرواہی سے کہتے ۔'' اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے ۔'' اور پھر مسکرا کر بس میں چڑھتے ۔ ہم نے ایسا نہیں کیا۔ سیدھے ہسپتال چلے گئے تو دلبر خان ناراض ہو گئے اور احتجاجاً گل فراز خان کے والد صاحب کی مزاج پرسی کے لئے ہسپتال نہیں گئے ۔ حالانکہ گل فراز خان کے والد صاحب سات آٹھ دن تک ہسپتال میں رہے ۔

کہنے کا مقصد یہی ہے کہ اگر دلبر خان کو خوش رکھنا ہے تو بازار جاتے وقت ان کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے ۔ ہاں اس کے لئے آپ کے پاس کافی وقت ہونا چاہیے ۔ابتداء میں میں نے عرض کیا ہے کہ دلبر خان پارٹی کی ناک ہیں یا دُم ۔ میرے خیال میں دلبر خان پارٹی کی ناک بننا ہی نہیں چاہتے بلکہ وہ دُم بنے رہنے میں خوش نظر آتے ہیں جبھی تو وہ پارٹی والوں کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں تو گویا فیصلہ یہی ہے ۔'' دلبر خان پارٹی کی دُم ہے ۔''

دلبر خان کا کہنا ہے کہ وہ ہر قسم کے درخت پر چڑھنے میں ماہر ہیں اور درخت کی جس شاخ کو کاٹنا چاہے کاٹ سکتے ہیں ۔ پچھلے دنوں دلبر خان بمعۂ آری ایک درخت پر چڑھے اور اس

کی ایک شاخ کو آری سے کاٹنا شروع کر دیا۔ دلبر خان بڑی تیزی سے شاخ پر آری چلا رہے تھے کہ نیچے سڑک پر لڑکیوں سے بھرا تانگہ گزرنے لگا۔ ایک لڑکی نے اوپر دیکھا۔ دلبر خان بڑی مہارت کے ساتھ آری چلا رہے تھے۔ لڑکی نے تانگے میں بیٹھے ہوئے دیگر لڑکیوں سے کہا۔ ''اوپر دیکھو۔ سامنے وہ لڑکا درخت کی نازک شاخ پر کھڑا دوسری شاخ پر کمال مہارت کے ساتھ آری چلا رہا ہے۔'' تانگہ گزر گیا مگر دلبر خان اس سے پہلے گردن موڑ کر لڑکی کی طرف دیکھ چکے تھے۔ لڑکی کافی خوبصورت تھی۔ دلبر خان دل پر چوٹ کھا گئے۔ گردن کو سیدھا کرنا چاہا تاکہ آری لگا کر شاخ کو کاٹنا شروع کر دے۔ مگر گردن کو نظر کا تیر لگ چکا تھا۔ دلبر خان کے لئے گردن ہلانا مشکل نہیں ناممکن ہو چکا تھا۔ آری کو نیچے پھینکا اور بڑی مشکل سے درخت سے نیچے اُترے۔

فقیر گل خان کا کہنا ہے کہ اس روز دلبر خان کو شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے فقیر گل خان کی بات کا اعتبار نہیں کیا کیونکہ دلبر خان خود کو بڑا تیس مار خان کہتا ہے۔ بیماری یا درد وغیرہ کو نہیں مانتا۔ خود کہتا ہے کہ جب انہیں کوئی درد یا بُخار وغیرہ قسم کی چیز ہو جائے تو بھاری کلہاڑی لے کر لکڑیوں کو چیرنے لگتا ہے اسی طرح ان کے جسم پر پسینہ آ جاتا ہے اور وہ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے۔ خود جب دلبر خان کا مشاہدہ کیا تو ان کو بیحد نڈھال اور بجھا بجھا پایا۔ چہرے کی رنگت زرد تھی اور گردن خمدار نظر آ رہی تھی۔ چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور عین بازو پر گردن رکھی ہوئی تھی۔ پوچھا دلبر خان کیسے ہوا؟ جواب دیا۔ ''درخت کی شاخ کاٹ رہا تھا کہ لڑکیوں کی نظر لگ گئی'' میں نے بھی غمازی کی۔

دوسرے دن پھر دیکھا فقیر گل خان جس جگہ منڈی تعمیر کر رہے ہیں وہاں چارپائی پر زاویہ نما انداز سے لیٹے ہوئے تھے۔ احوال پوچھا کہنے لگے ''بیحد تکلیف ہے'' میں نے چائے کا آرڈر دیا چائے آ گئی۔ اس روز مستری تو تین تھے۔ لیکن مزدور صرف دو عدد۔ ایک مستری زرین گل، اینٹ کا کام کر رہا تھا۔ باقی دو مستری پتھر کا کام کر رہے تھے میں نے دلبر خان سے چائے ذرا جلدی پینے کے لئے کہا تاکہ کچھ پتھر یا اینٹ مستریوں کو سپلائی کریں۔ فقیر گل خان کے

ہمراہ گل فراز خان اور راجہ خان بھی کام میں لگے ہوئے تھے۔ہم نے چائے ختم کی۔ دلبر خان کو بمشکل اُٹھایا انہیں ترغیب دی پتھر اُٹھانے سے جسم پر پسینہ آ جاتا ہے اور پسینہ سے جسم نرم پڑ جاتا ہے۔آپ کی گردن کی کوئی رگ اُلٹی ہوگئی ہے۔ اگر آپ دونوں ہاتھوں سے پتھر اُٹھا کر گردن کے اوپر تک لے جاتے ہیں تو چند منٹوں بعد آپ کو پسینہ آنا شروع ہو جائے گا۔ اور گردن کی رگ نرم ہو کر خود بخود سیدھی ہو جائے گی۔ دلبر خان نے جب دو تین پھیرے لگائے تو آہستہ آہستہ ان کی رنگت سرخ ہوتی گئی۔اور گردن جو تھوڑی دیر پہلے ٹیڑھی نظر آ رہی تھی اب سیدھی ہونا شروع ہوگئی تھی۔ میں نے دلبر خان کو مشغول رکھنے کی خاطر مستری زرین گل کو اینٹیں سپلائی کرنا شروع کر دیں۔

چند پھیروں کے بعد دیکھا دلبر خان چارپائی پر دراز پڑے ہیں بہت آوازیں دیں۔ بڑی غیرت دلائی لیکن وہ اپنی جگہ پڑے رہے میں نے بھی پھیرے لگانے چھوڑ دیئے اور دلبر خان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں اُن کی بیماری کے متعلق بولتا رہا اور جواب میں وہ ''ہوں ہاں'' کرتے رہے۔صاف ظاہر تھا کہ اُنہیں میری باتوں سے ذرا دلچسپی نہیں۔ میں نے سید ولی ہوٹل والے کو چائے کا آرڈر دیا اور ساتھ ہی کہا کہ چونکہ دلبر خان بیٹھا ہے اس لئے چائے خالص دودھ پتی بھیجئے گا۔ میں نے دلبر خان کی تعریف شروع کی اور وہ خوش ہو کر چائے سے شغل فرماتے رہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا'' عجیب آدمی ہے سچ سے ناراض اور جھوٹ سے خوش ہو جاتے ہیں''۔لیکن جلد ہی میں نے اس سوچ سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔

۴-۶-۱۹۸۵ء

......☆......

نارنجی کا مہمان

کل ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ہم بالا خانہ میں بیٹھے ہوئے گپ شپ میں مصروف تھے اور خاص کر گپ کا موضوع ملک صاحب کی ذاتِ مبارک تھی۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ قریباً دو ماہ پیشتر ملک صاحب نے ایک شخص کی معرفت جو کہ نارنجی کا رہنے والا ہے موسیٰ خان و محمد شیر خان کے لئے کچھ عمارتی لکڑی خریدی تھی۔ ملک صاحب تو جابر اور سینہ زور واقع ہوئے ہیں۔لکڑی کے لئے رقم ساتھ لینا بھول گئے تھے۔رقم کی ذمہ داری میں وہی شخص دے گئے قرض کی ادائیگی کے لئے میعاد تو ہوتی ہے۔ میعاد بھی ملک صاحب نے اپنی طرف سے مقرر کر دی۔یعنی بیس پچیس دن۔ہمیں سارے قصہ کا علم تو تھا اور جو کچھ رونما ہونے والا تھا اُسی کو بھی ہم جانتے تھے۔ فقط یہ انتظار تھا کہ وہ گھڑی کب آنے والی ہے۔

میں سبزی خریدنے نیچے اُتر گیا امیر الدین سے سبزی خریدر ہا تھا پاس اسلم شاہ خان کی دکان پر اُن سے علیک سلیک ہوگئی۔انہوں نے ملک صاحب کی بات شروع کی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اگر چہ اس کا مجھے علم تھا لیکن ان پر یہ ظاہر کرتا رہا کہ مجھے اس واقعہ کا پہلی دفعہ انہی کے ذریعے علم ہو رہا ہے۔آخر میں اسلم شاہ خان نے کہا کہ وہ شخص کل سے آیا ہوا ہے اور ملک صاحب سے رقم لے کر ہی جائے گا۔ میں نے اسلم شاہ سے اس شخص اور ملک صاحب کے بارے میں دریافت کیا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں اسلم شاہ نے کہا۔کہ اس وقت دونوں مدوڈھیری میں ہیں۔

میں بالا خانہ آیا۔گل فراز خان، دلبر خان، شیر خان وغیرہ کو یہ بات بتا دی اور ملک صاحب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔اسلم شاہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ شخص دراصل ان کا اور ان کے والد صاحب کا دوست ہے۔ ملک صاحب کو ان کے ذریعے جانتا ہے۔خیر ہم تبصرہ کر

رہے تھے کہ اچانک سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو ملک صاحب خراماں خراماں چلے آرہے ہیں خوش آمدید کہنے کے بعد میں نے فوراً ملک صاحب سے اسلم شاہ خان والی بات کہہ دی۔ اور ساتھ ہی اس شخص کے متعلق پوچھا ''کہاں ہے وہ بدتمیز میں اسے تھانے میں دینے کا ارادہ کر چکا ہوں۔'' ملک صاحب نے بد دلی بلکہ مایوسی سے کہا۔ ''بس چلا گیا''۔ میں نے کہا ''رقم'' دے دی؟'' اسی طرح بد دلی و مایوسی سے ملک صاحب نے جواب دیا۔ ''ہاں! رقم دے دی۔'' میں نے کہا ''وہ تو اب بھی مدو میں ہے۔ کہا، ''ہاں!'' میں نے کہا ''تو رقم پھر ان کو نہیں ملی ہوگی۔'' کہا۔ ''بس میں نے موسیٰ ومحمد شیر کو کہہ دیا ہے کہ اس شخص کو رقم دے دو اور انہوں نے دے دی ہوگی۔'' ہم سب نے کہا کہ وہ دونوں تو سامنے بنک کے کھڑے تھے یوسف خان بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اور یوسف خان بعدازاں بینک سے کوئی چیز رومال میں لپٹی ہوئی لے کر حاجی آدم خان کی دکان میں گھسے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ موسیٰ خان اور محمد شیر خان کے لئے رقم مبلغ بیس ہزار روپے بینک سے حاصل کی ہو کیونکہ منیجر صاحب بھی بینک سے نکل کر یوسف خان کے پیچھے حاجی صاحب آدم خان کی دکان کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے۔ ملک صاحب نے کہا کہ بس پھر تو ٹھیک ہے۔ ابھی موسیٰ خان وغیرہ اس کو رقم دے دیں گے۔

یہ بات ہو رہی تھی کہ موسیٰ خان اوپر چڑھ آئے۔ ہم نے موسیٰ خان سے پوچھا کہ بینک سے رقم مل گئی۔ کہا ''نہیں''۔ ہم نے کہا کہ ملک صاحب کہہ رہے تھے کہ اس شخص کو اس کا قرض مل چکا ہے۔ موسیٰ خان بولے۔ ''اس ملک صاحب نے ہمیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے ہم حیران ہیں کہ یہ آپ لوگوں کی پارٹی میں رہتے ہوئے بھی عقل سے پیدل ہیں۔'' موسیٰ خان جذباتی انداز میں بولے جا رہے تھے اور ملک صاحب خاموشی سے سن رہے تھے۔ موسیٰ خان نے کہا کہ میں جا کر اس شخص کو ملک صاحب کے پاس بھیج دیتا ہوں کیونکہ وہ بغیر رقم لئے ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔ ملک صاحب نے غصہ میں آکر موسیٰ خان سے کہا ''اس شخص کو میرے پاس نہ بھیجو۔ ورنہ میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' ایک سیکنڈ کے لئے یہ خیال میرے ذہن میں در آیا کہ کیا

نیکی کا یہی صلہ ہوتا ہے؟ لیکن جلد ہی میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور ملک صاحب سے عرض کیا کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو اس شخص کو پولیس تھانہ میں بھی دیا جا سکتا ہے تا کہ اسے اپنے کئے کی سزا مل سکے۔ لیکن ملک صاحب پر میری بات کا اثر نہیں ہورہا تھا۔ شاید ملک صاحب خود پولیس اور تھانہ سے الرجک تھے۔ موسیٰ خان اور ملک صاحب لڑنے کے قریب پہنچ رہے تھے ہم نے موسیٰ خان کو رخصت کیا اور ملک صاحب کو حوصلہ دیا کہ اس شخص سے ڈرنے کی کوئی وجہ ہمیں نظر نہیں آتی۔ یہ سب کچھ اسلم شاہ خان کی کارستانی ہے۔ اُس نے اُس شخص کو بتایا ہے کہ ملک صاحب کمزور قسم کے شخص ہیں۔ لہٰذا اُن پر رعب ڈال کر ان کو خوف زدہ کیا جا سکتا ہے اور اُن سے حسب منشا کام لیا جا سکتا ہے لیکن ان کو کیا معلوم کہ ملک صاحب اتنی آسانی سے قابو میں آنے والے نہیں۔

......☆......

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ملک صاحب سبز علی خان فولادی اعصاب کے انسان ہیں۔ دلیری اور بہادری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر کوئی ان کو کسی چیز سے تشبیہہ دینا چاہے تو شیر سے ان کی تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ بڑے مضبوط دل گردے کے انسان ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسانوں نے اتحادیوں پر حملہ کر دیا۔ ملک صاحب کو مطلع کیا گیا۔ فوراً بندوق بمعہ کمر بند لیا اور سینہ تان کر پارٹی کے آگے بطور کمانڈر موضع کنج کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم پارٹی والے بھی ان کے ہمراہ تھے۔

بات چونکہ پرانی ہے ان دنوں کلاشنکوف جیسا اسلحہ یہاں متعارف نہیں ہوا تھا۔ میرے ساتھ چھرے دار بندوق تھی۔ موقع پر پہنچے اور ایک پہاڑی پر مورچہ زن ہوئے۔ ہم کوئی تیس چالیس آدمی تھے۔ مقابل پہاڑی پر کسان لوگ چھپے ہوئے تھے۔ ہمارے آدمیوں کو جونہی کوئی کسان قسم کی چیز نظر آئی اُن پر فائرنگ شروع کی۔ ملک صاحب شانِ بے نیازی سے پہاڑی کے اوپر چہل قدمی کرتے رہے۔ موضع کنج والوں نے دوپہر کی روٹی شاید پہاڑی کے اوپر کھائی تھی اور کچھ بچی کچی روٹیاں اور پیاز کے ٹکڑے وہاں پر دسترخوان میں پڑے تھے۔ اس وقت سہ پہر کا وقت تھا اور جو چھرے دار بندوق میرے پاس تھی۔ وہ مجھ سے جمعہ خان نامی شخص نے لے لی تھی اور میں فارغ بیٹھا تھا۔ ہمارے آدمی گاہے بگاہے نشانے لے لے کر فائر کرتے اور ساتھ ہی ساتھ چیختے چلاتے۔ خود کو مشغول رکھنے کی خاطر میں روٹی اور پیاز کی طرف متوجہ ہوا۔ ملک صاحب سے تناول فرمانے کو کہا مگر ملک صاحب نے پیاز روٹی کھانے سے بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

شام کا اندھیرا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا بلکہ اندھیرا پھیل چکا تھا کسانوں نے مقابل

پہاڑی سے بہ یک وقت کئی فائر کئے۔ اس طرف ہمارے آدمیوں نے فائر داغنے شروع کئے۔ حشر کا سماں بندھ گیا۔ میں بے حد محفوظ تھا۔ پھر بھی سچی بات تو یہ ہے کہ میں ڈر رہا تھا اور رہ رہ کر ممبر صاحب (فقیر گل خان) کا خیال ستا رہا تھا۔ اتنے میں ہماری پارٹی کے دو آدمی پہاڑی سے نیچے اُترے اور تیزی سے واپس جانے لگے۔ ارے یہ تو میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ آگے والا شخص بندوق کندھے سے لٹکائے سینہ تان کر دوڑ رہا تھا اور پیچھے والا شخص جو قد کاٹھ سے ہو بہو ممبر صاحب لگ رہا تھے۔ آگے والے شخص سے آگے نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دل کو ایک ٹھیس لگی۔ ہمارا جگری دوست میدان کارزار چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ یا اللہ یہ میدان جنگ بھی کتنی خوفناک شے ہے۔

چند منٹ کے بعد فائرنگ رک گئی۔ شاید کسان اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر مورچے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ہمارے ساتھی اکھٹا ہونا شروع ہو گئے۔ میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں مغرب کی جانب سے ممبر صاحب (مسلح) نمودار ہوئے۔ کوئی میری خوشی کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ واقعی دل باغ باغ ہو گیا۔ ہمارا جگری دوست ممبر صاحب اس کڑی آزمائش میں پورا اترا تھا۔ واقعی مجھے ان پر فخر کرنا چاہیے۔ ہم سب لوگ پہاڑی سے اتر کر موضع کنج چلے آئے۔ کنج والوں نے ہمارے طعام و قیام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہیں پر کل صبح تک پڑے رہے۔ بعد میں ان دو آدمیوں پر (جو میدان سے فرار ہو گئے تھے) تبصرے شروع ہوئے میں نے ممبر صاحب والا قد کاٹھ کا جو شخص دیکھا تھا۔ وہ تو ہمارے ایک دوست کا بھائی تھا۔ البتہ دوسرے صاحب کے متعلق میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ ملک صاحب ہرگز نہیں تھے۔ ممبر صاحب فقیر گل خان مصر ہیں کہ بھاگنے والا شخص ملک صاحب سبز علی خان ہی تھے۔ میرے پاس اُن کے بے جا شک کا کوئی علاج نہیں۔

دراصل مجھے ملک صاحب کی طبیعت کا بخوبی علم ہے۔ ملک صاحب ہیں تو فولادی اعصاب کے انسان مگر دل کے ایسے نرم ہیں جیسے موم۔ ایک بات اور ہے کہ ملک صاحب نشانہ

لگانے کے بہت ماہر ہیں ۔کوئی ان کی فائر کی زد میں آیا تو سمجھو کہ ڈھیر ہو گیا۔ یہ کسان لوگ شرارتی تو ہیں ۔لیکن بڑے سادہ دل اور غریب قسم کے لوگ ہیں ۔اب خدانخواستہ ملک صاحب دل کے سخت ہوتے اور دو چار کسان ان کی فائر کی زد میں آتے تو بیچاروں کا ناحق خون ہو جاتا۔ کسانوں کے گھر صف ماتم بچھ جاتی۔ خدانخواستہ ملک صاحب کے ہاتھ خون سے رنگین ہو جاتے ۔مگر شکر ہے اور آفرین ہے ملک صاحب پر کہ انہوں نے کسی کسان کو اپنی بندوق کی زد پر نہ لیا۔ اور کسانوں کو صاف طور پر بچ نکلنے کا موقع فراہم کیا۔ بالفرض اگر ملک صاحب واقعی میدان سے چلے آئے ہیں تو اسے ملک صاحب کی کمزوری پر محمول نہ کیا جائے بلکہ یہ ان کی غایت درجہ کی رحمدلی اور صلہ رحمی کا نتیجہ ہوسکتا ہے ۔ممبر صاحب میں لاکھ خوبیاں سہی مگر ان کی یہ برائی لاکھ خوبیوں پر بھاری ہے کہ وہ ملک صاحب پر بزدلی اور خوف زدگی کا الزام لگا رہے ہیں ۔

میرا چشم دید واقعہ ہے میں اور ملک صاحب بالا خانے کی گیلری میں کھڑے بازار کا نظارہ کر رہے تھے ۔ نیچے سڑک پر ایک حاجی صاحب گزر رہے تھے ملک صاحب نے جو دیکھا فوراً آنکھ اور انگلی کی زد پر لیکر فرمایا۔''یہ حاجی صاحب یہاں سے بڑی آسانی سے لگ سکتا ہے ۔'' میں سمجھ گیا کہ ملک صاحب کے تیور ٹھیک نہیں ہیں ۔اس وقت کچھ بھی کر گزر سکتے ہیں ۔ بے چارہ حاجی صاحب کسی بھی لمحے ڈھیر ہو سکتے ہیں ۔ میں نے ملک صاحب کے اندر چھپے ہوئے رحمدلی کے جذبے کو پکارا۔جس سے ملک صاحب ہمیشہ مغلوب ہو جاتے ہیں اور یہاں تو صورت حال اور بھی نازک تھی اس حاجی صاحب نے ملک صاحب کو کسی سخت وقت میں مبلغ دوسو روپے بطور قرض حسنہ دیئے تھے ۔ ملک صاحب کے اندر کی رحمدلی فوراً جاگ اُٹھی ۔ ملک صاحب مسکرائے کمالِ فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حاجی صاحب کو معاف کیا اور مجھے منوں ٹنوں کے حساب سے زیرِ احسان فرمایا۔

بعد میں جب ممبر صاحب سے واقعہ کا ذکر کیا تو ممبر صاحب کا کہنا تھا کہ ملک صاحب دراصل چاہتے یہی تھے کہ کوئی اور حاجی صاحب کو ختم کر دے کہ ملک صاحب آسانی سے واجب

الا دا قرضہ سے بری الذمہ ہو جائیں۔ممبر صاحب ہر معاملہ میں بال کی کھال اُتارنے کے عادی ہیں۔ ملک صاحب ایسے نہیں ہیں کم از کم میں ملک صاحب کو ایسا نہیں سمجھتا۔ ملک صاحب کے نزدیک روپیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔دوسو روپیہ تو کیا دو ہزار روپیہ کا قرض بھی بڑی خندہ پیشانی سے ادا کرتے ہیں۔

میں نے خود ایک دفعہ ملک صاحب کو مبلغ دوسو روپے کا قرض دیا تھا کچھ عرصہ بعد ملک صاحب سے عرض کیا کہ آدھا قرضہ میں معاف کرتا ہوں آدھا ادا کردیں۔ ملک صاحب بڑی خوشی سے راضی ہوئے۔ بیچ میں ممبر صاحب نے بے جا مداخلت کی کہا۔''تمہارا باقی آدھا قرضہ بھی اسی طرح ادا کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ تم اتنا عرصہ اور انتظار کرلو''۔ ملک صاحب ہیں تو فولادی انسان لیکن ورغلانے میں بہت جلد آجاتے ہیں ممبر صاحب نے انہیں ورغلایا ورنہ شاید میری بات پر وہ راضی ہو جاتے اور آدھا قرضہ اُس وقت ادا کر دیتے۔ایسے موقعوں پر ممبر صاحب سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

یوں تو ملک صاحب ہمہ صفت انسان ہیں لیکن اس وقت چونکہ بات ان کی فولادی اعصاب کی ہو رہی تھی تو قارئین کی دلچسپی کے لئے میں مزید کچھ چھوٹے موٹے واقعات کا ذکر کرتا چلوں جس سے ایک طرف ملک صاحب کی دلیری اور بہادری پر روشنی پڑے گی اور دوسری طرف ان کی رحم دلی اور صلہ رحمی لوگوں کے سامنے آتی جائے گی۔

گاؤں میں دو بزرگوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا۔ایک نے دوسرے کی بے عزتی کی۔ ملک صاحب مطلع ہوئے واقعہ برداشت سے باہر تھا فوراً بندوق اور کمر بند زیب تن کر کے موقع پر پہنچے اور ظالم فریق کو بے نقط سنائیں۔وہاں ایک آدمی بغداد شاہ نامی گھر سے نکل آیا جب دیکھا کہ ملک صاحب گالیوں سے شغل فرما رہے ہیں اور مسلح حالت میں ہیں تو اس نے جیب سے چاقو نکالا اور ظالم شخص کا طرفدار بن کر ملک صاحب پر حملہ آور ہونا چاہا۔ملک صاحب نے جب دیکھا کہ بغداد شاہ نامی شخص خود کو موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے تو وہ کمالِ ہوشیاری

سے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جاتے ہوئے بغدادشاہ سے کہا کہ ''تمہارے ساتھ کل دیکھوں گا''۔

اگر ملک صاحب چاہتے تو ان کے لئے بے چارے بغدادشاہ کا ختم کرنا دائیں اُنگلی کا کام تھا ملک صاحب دائیں انگلی دباتے شعلہ اُگلتا اور بغدادشاہ زمین پر تڑپتا۔ مگر نہ نہ! ملک صاحب نے کمال رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغدادشاہ کو زندگی بچانے کا موقع فراہم کر دیا۔ بعد میں واقعہ کا علم ممبر صاحب کو ہوا اور ممبر صاحب نے پھر وہی بے مزہ تبصرہ شروع کر دیا کہا ''ملک صاحب چاقو کے خوف سے میدان چھوڑ کر چلے گئے۔'' انصاف کی بات یہ ہے کہ رائفل کے سامنے چاقو کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ اور پھر رائفل بھی ملک صاحب کے ہاتھ میں۔ اور ہاں ایک دو روز بعد اسی بغدادشاہ نامی شخص کو ملک صاحب کے برادرخورد محمود شاہ خان نے اُٹھا کر پختہ سڑک پر دے مارا۔ اور ساتھ ہی دو چار ٹھوکریں بھی رسید کیں بعد میں بغدادشاہ نے اُلٹا ملک صاحب کو گریبان سے پکڑ کر مارنے کی کوشش کی۔ آفرین، شاباش ملک صاحب پر۔ اسی حالت میں بھی بغداد نامی شخص کے سامنے کسی قسم کی مزاحمت پیش نہیں کی ورنہ اگر ملک صاحب چاہتے تو مار مار کر بغدادشاہ کا بھرکس نکال دیتے۔ ملک صاحب سے جب واقعہ کے متعلق پوچھا گیا تو ملک صاحب نے فرمایا کہ دراصل غلطی ان کے چھوٹے بھائی محمود شاہ خان کی تھی۔ کہ اس نے بیچارے بغدادشاہ کو اُٹھا کر پختہ سڑک پر دے مارا تھا۔ ایسے میں اگر بغداد نامی شخص غصہ اور اشتعال میں آ کر کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ دیکھا آپ نے! ملک صاحب کی فراخدلی اور رحم دلی کا شاندار مظاہرہ۔ ایک ممبر صاحب ہیں، بال کی کھال نکالنے والے۔ جب میں نے ممبر صاحب سے کہا کہ اس واقعہ پر ملک صاحب کو شاباش تو دو۔ تو اس پر ممبر صاحب آگ بگولہ ہو کر کہنے لگے۔ ''شاباش! کس چیز کی؟ میرا تو دل چاہتا ہے کہ ملک صاحب کو مزید دو تین تھپڑ رسید کر دوں کہ انہوں نے بغداد نامی شخص کو کچھ بھی نہیں کہا۔''

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں اور ملک صاحب یوسف چپل والے دکاندار کے برآمدے

میں کھڑے تھے اتنے میں اسلم خان عرف اسلمے ولد افضل خان ٹھیکیدار ہماری طرف آئے ملک صاحب مسکرائے اور مجھ سے کہا۔ ''اگر تم چاہو تو اس اسلمی کو پکڑ کر سڑک پر دے ماروں۔'' اتفاق سے ہمارے بالمقابل سڑک پر صوبیدار منیر خان کھڑے تھے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ صوبیدار منیر خان سے پنجہ آزمایا جائے۔ ملک صاحب نے میری تجویز کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ اس اسلمی کو سڑک پر پٹخنے میں ان کو دو تین منٹ ہی لگیں گے۔ میں نے اپنی تجویز پھر دہرائی اور ملک صاحب کو صوبیدار منیر خان سے پنجہ آزمانے کو کہا۔ میری بات کو پھر نظر انداز کر کے اور سنی ان سنی کر کے ملک صاحب نے کہا کہ اس اسلمی کو سڑک پر گرانے میں بس چند لمحے ہی خرچ ہوں گے۔ مجھے ملک صاحب کی دکھتی رگ کا پتہ چلا۔ اُن کی رحم دلی کو آواز دی میں نے کہا ملک صاحب اسلم غریب آدمی ہے۔ آپ کو اپنی بے پناہ طاقت کا پتہ نہیں کہیں اس بیچارے کی دو چار ہڈیاں ٹوٹ نہ جائیں۔ ملک صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کہنے لگے۔ تمہاری بات ٹھیک ہے۔

جب ممبر صاحب سے ذکر کیا گیا تو کہنے لگے ویسے تو ملک صاحب کی عقل سے کٹی رہتی ہے لیکن اس معاملے میں ذرا سمجھداری سے کام لیا ہے۔ اگر صوبیدار منیر خان سے پنجہ آزما ہوتے تو اپنی دو چار ہڈیاں تڑوا بیٹھتے۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی کہ ممبر صاحب کی سمجھ میں یہ موٹی سی بات نہیں آئی کہ ملک صاحب ملازم پیشہ حضرات کی دل و جان سے قدر کرتے ہیں ۔منیر خان کو فوج میں حکومت نے صوبیداری عنایت کی تھی۔ ملک صاحب منیر خان سے ڈرنے والے نہیں تھے بلکہ ان کی صوبیداری کے قدردان تھے اور ان سے اچھے تعلقات کے خواہاں تھے۔

یہ اور بات کہ بعد میں ملک صاحب صوبیدار قسم کی ہر چیز سے متنفر ہو گئے تھے کیونکہ پیر صاحب لعل بادشاہ نامی صوبیدار نے ملک صاحب کے سامنے عقل سے عاری ہونے کا بڑا مظاہرہ کیا۔ ہم نے صوبیدار لعل بادشاہ سے ملک صاحب کا تعارف کرایا اور ساتھ ہی کہا کہ ملک

صاحب حاجی صاحب سردار خان مرحوم کے بڑے صاحبزادے ہیں۔صوبیدار لعل بادشاہ جھٹ سے بولے۔''ملک صاحب! اگر میرے دل میں اپنے لئے عزت چاہتے ہو تو پھر جب میں دوبارہ کاٹلنگ آؤں تو آپ کی حجامت صاف ہو۔آپ لڑکے ہوتے ہوئے اپنے چہرے پر اتنا بوجھ اُٹھائے لئے پھرتے ہو''۔صوبیدار لعل بادشاہ جب چلا گیا تو ملک صاحب نے اُنہیں بڑا سست اور بیوقوف کہا اور ساتھ ہی کہنے لگے کہ یہ فوجی لوگ سارے بیوقوف ہوتے ہیں اور بطور خاص صوبیدار رینک والے۔

وہ تو شکر ہے کہ صوبیدار منیر خان والا معاملہ صوبیدار صوبیدار لعل بادشاہ والے معاملہ سے پہلے تھا ورنہ اگر منیر خان صوبیدار کا معاملہ بعد کا ہوتا اور میں ملک صاحب کو صوبیدار منیر خان سے دو دو ہاتھ کرنے کا اشارتاً کہتا بس پھر کیا ہوتا ملک صاحب صوبیدار منیر خان کو مار مار کر اور اُٹھا اُٹھا کر بیچارے کا حشر کر دیتے شکر ہے بیچارا صوبیدار منیر خان بچ گیا۔

میں یہ کوئی ہوائی نہیں اُڑا رہا میرا چشم دید واقعہ ہے بلکہ تمام پارٹی والوں کا چشم دید ہے ایک دن بالا خانہ کے کمرے میں بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے ایک مہمان بھی تھا جو ذات کا گوجر تھا ملک صاحب مہمان سے ایک واقعہ کے متعلق پوچھ رہے تھے۔محفل میں دلبر خان بھی بیٹھا تھا۔دلبر خان نے مہمان اور ملک صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو میں مداخلت کی۔ملک صاحب نے دلبر خان سے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ملک صاحب مہمان کی طرف متوجہ ہوئے اور مہمان سے بات شروع کرنے کو کہا۔مہمان نے دوبارہ بات شروع کی۔چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ دلبر خان نے پھر ملک صاحب اور مہمان کی بات میں مداخلت کی۔ملک صاحب نے دلبر خان کو ڈانٹا۔دلبر خان ملک صاحب کی طرف سے ڈانٹ پلانے پر شاید ناراض ہو گیا اس نے ملک صاحب کو نہایت بلند آواز سے ''چپ'' کہا۔ملک صاحب تو جیسے جل اُٹھے۔دلبر خان کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور دونوں میں نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ہم نے دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی۔ملک صاحب چارپائی میں کھڑے دلبر خان پر جھپٹنے کی تگ و دو کر رہے تھے

میں چونکہ درمیان میں تھا اس لئے ملک صاحب کو دلبر خان پر حملہ کرنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد ملک صاحب کی طاقت کے سامنے بے بس ہو جاؤں گا۔ جس کے بعد دلبر خان ملک صاحب کے رحم و کرم پر ہوگا۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ ملک صاحب دلبر خان پر یوں جھپٹ رہے ہیں جیسے شیر اپنے شکار گائے یا بکری پر جھپٹتا ہے۔ میرے تصور کے پردے پر فلم کی ریل چلنے لگی۔ دلبر خان ملک صاحب کے ہاتھوں میں اوپر اُٹھا اور نہایت بے دردی سے زمین پر پٹخ دیا گیا۔ پھر اُٹھایا گیا اور پٹخا گیا پھر اُٹھا گیا اور پٹخا گیا۔ پھر وہ لاتوں اور گھونسوں کی زد میں آ گیا۔ دلبر خان نے چیخ و پکار سے آسمان سر پر اُٹھایا ہوا تھا۔ اُف اب تو ایک خوفناک منظر شروع ہوا۔ ایک بڑی ڈاڑھی والا خوفناک شخص دلبر خان جیسے ادھ مؤا شخص کو سر سے اوپر اُٹھا کر بالا خانے کے نیچے پختہ سڑک پر پھینک رہا تھا۔ میرے تو رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔ اُف خدایا دلبر خان کس بیدردی سے موت کے بے رحم منہ میں جا رہا تھا۔ اور میں اسے بچانے میں بالکل بے بس تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے پورا زور لگایا جس کی وجہ سے میں اپنی اصلی حالت میں آیا۔ مجھے ملک صاحب اور دیگر پارٹی کے دوست نظر آئے۔ ملک صاحب اب بھی چارپائی پر کھڑے زور لگا رہے تھے۔ میں نے دیکھا ملک صاحب نے ایک ہاتھ سے اپنا پاجامہ اور ازار بند پکڑ رکھا ہے اور ایک ہاتھ سے دلبر خان کو مارنے کے لئے زور لگا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا دلبر خان پیلا پڑ گیا ہے۔ ہم نے منت سماجت اور کچھ غصہ سے ملک صاحب کو چپ کرایا۔ پورا بازار بالا خانے پر یلغار کر چکا تھا۔ لوگوں کو نیچے اُتارا۔ میں نے بعد ازاں ملک صاحب سے پوچھا کہ آپ پاجامہ سے چاقو یا پستول نکالنے کی کوشش کیوں کر رہے تھے۔ لڑائی کے دوران ملک صاحب نے ایک ہاتھ سے پاجامہ اور ازار بند پکڑ رکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ ملک صاحب چاقو یا پستول نکالنے کی کوشش میں ہیں۔ ملک صاحب مسکرا کے کہنے لگے ''میرے پاس چاقو یا پستول نہیں تھی دراصل غصہ اور اشتعال اتنا چڑھ گیا تھا کہ میرے جسم سے پاجامہ پھسل کر نیچے جا رہا تھا اور میں اُسے پھسلنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

ملک صاحب کا اُصول ہے کہ وہ خود کسی کو نہیں چھیڑتے لیکن اگر اُنہیں چھیڑا جائے تو پھر وہ اپنا بدلہ لینا بھی خوب جانتے ہیں ملک صاحب کہتے ہیں کہ وہ شریفوں کے ساتھ شریف اور خراب آدمیوں کے لئے شمشیرِ برہنہ یعنی ننگی تلوار ہیں۔

گل بیکری والے نے ایک دفعہ بداخلاقی کا مظاہرہ کیا ملک صاحب نے اس کا گلہ اس زور سے دبایا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے گل کو بہت سمجھایا۔ پیٹ کے معاملہ میں ملک صاحب بداخلاقی برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر ملک صاحب کے منظورِ نظر بننا چاہتے ہو تو ملک صاحب کو کھلاؤ، پلاؤ۔ الٹا تم چندے کی رقم مسلسل اپنے پاس رکھ رہے ہو اور ملک صاحب پر خرچ نہیں کر رہے۔ آج تو ہم نے تمہیں بمشکل بچا لیا لیکن آئندہ ہم اس کی گارنٹی نہیں دے سکتے کہ تم ملک صاحب کے غیض وغضب سے زندہ بچ سکو گے۔ لگتا ہے کہ گل خان بھی ہوشیار آدمی ہیں کیونکہ اس کے بعد اس نے ملک صاحب سے پھڈا لینے کی کوشش نہیں کی اور وعدہ کیا کہ ہر عید کو بسکٹوں کا ایک ڈبہ اُن کی خدمت میں باقاعدگی کے ساتھ پیش کرتے رہیں گے۔

......☆......

الٹی میٹم

بنام ملک صاحب سبز علی خان

(نوٹ: ویسے تو ملک صاحب خفہ ہونے کے بعد جلدی راضی ہو جاتے تھے لیکن اس دفعہ ایسا لگتا ہے کہ وہ آسانی سے راضی نہیں ہو رہے اور اُن کے دوست کبھی اُن پر دباؤ ڈال کر اور کبھی اُن کو لالچ دے کر رام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔)

ان دنوں آپ جوش میں ہیں۔ جوش اگرچہ اچھی چیز ہے لیکن زیادہ دیر تک ہو تو وبالِ جان بن جاتا ہے۔ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جوش کو چھوڑ کر ہوش میں آجاؤ اور ٹھنڈے دماغ سے عقل کے ناخن لے کر سارے بدن کو کریدو۔ آپ اس وقت سخت غلطی پر ہیں۔ پارٹی کے ساتھ دشمنی رکھنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ اور نہ آپ میں اتنی طاقت ہے کہ آپ پارٹی کے ساتھ دشمنی رکھ سکیں۔ پارٹی متفقہ طور پر آپ کو دو دن یعنی ہفتہ کی شام تک مہلت دیتی ہے کہ آپ جلد سے جلد اپنا رویہ درست کرلیں۔ آپ کے دماغ میں جو فتور آچکا ہے اس کو دماغ سے نکال دیں۔ ہوش وحواس کو درست کرلیں اور اپنی اولین فرصت میں ''پارٹی دفتر'' میں حاضری دیں۔ بصورت دیگر بلکہ مجبوراً آپ کو پارٹی سے خارج کرنے پر غور شروع ہو جائے گا۔

آپ کو تو پتہ ہے کہ پارٹی میں بہت سے لوگ آپ کے خلاف ہیں اور وہ آپ کے جانے پر بڑے خوش ہوں گے اس لئے عقل کا تقاضا ہے کہ اُن کی خوشی میں زہر گھول دو اور فوراً واپس آجاؤ۔

تمہارے سر میں جو تھوڑا بہت مغز ہے اس سے کام لیتے ہوئے پارٹی دفتر تشریف لاؤ۔ اگر آپ اس طرح جوش میں رہے۔ بیوقوفی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اپنی ناراضگی کو طول دیتے رہے تو پارٹی باامرِ مجبوری آپ کو پارٹی سے نکال کر آپ کی جگہ دوسرے کسی ''شریف'' آدمی کو شامل کر دے گی۔ شاید اس صورت میں میرے سوا پارٹی کے کسی ممبر کو افسوس نہیں ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ آپ میں عقل کی جوتھوڑی بہت رمق باقی ہے آپ اس سے کام لیکر ''مصنوعی غصہ'' کوتھوک کر پارٹی میں جلد سے جلد آنے کی کوشش کریں گے۔ یقین جانیئے! پارٹی میں آنے سے آپ کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔نقصان کوئی نہیں ہے۔آپس کی بات ہے آپ جیسے زبان دراز، کام چوراور کم عقل شخص کوکون پارٹی میں شامل کرنے کے لئے تیار ہوگا؟ اورآپ کوتو ایک دفعہ تجربہ بھی ہو چکا ہے یاد ہے سعید شاہ خان اورسرفراز خان والی بات؟ اگر یادنہیں تو یادکریں؟

بہرحال اگر کل تک یعنی جمعہ بارہ بجے تک آپ پارٹی میں یعنی دفتر واپس ہنسی خوشی آگئے تو ہم سب مل کرآپ کی خوب آؤ بھگت کریں گے۔آپ کے لئے دوعدد مرغ روسٹ اور دوکلولنگڑا آم کا انتظام کیا جائے گا۔اس کے علاوہ ایک جگ الا ئچی کا شربت بھی پیش کیا جائے گا۔ یقین جانو! میں نے اوپر جو کہا ہے وہ درست ہے۔ میں آپ کی طرح منافق نہیں ہوں کہ ایک بات کروں اور پھراس سے مکر جاؤں۔کیا یاددلانے کی ضرورت ہے کہ کتنی دفعہ آپ نے بات کی اور پھراس سے مکر گئے۔

میں نے جو کچھ تحریر کیا آپ کے بھلے کے لئے تحریر کیا مجھے اپنا دوست، غمخوار وغمگسار سمجھو۔اپنی اولین فرصت میں پارٹی میں آجاؤ ورنہ نقصان میں رہو گے۔ ذرااس وقت کو یاد کرو جب آپ بے یارومددگار اور بری حالت میں اڈہ میں، گاؤں میں اور راستوں میں پھررہے ہوں گے۔اس لئے میری بات مان جاؤ اور پارٹی میں جلداز جلد واپس آنے کی کوشش کرو۔فقیر گل، گل فراز خان، شاہ حسین خان، عثمان غنی، منتظر گل خان، شیر خان، شاکر خان، راجہ خان، دلبر خان، یارمحمد خان، مقدر خان، اکرم خان اور دیگر ہمدردان پارٹی بڑی شدت سے آپ کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ آجاؤ، غصہ تھوک دو۔ شیطان کا کہا مت مانو۔ پارٹی نے مچھلی پکڑنے یا پیر بابا جانے کا پروگرام بنایا ہے اولین فرصت میں آکر پروگرام کوعملی شکل دو۔ ورنہ تمہارے مخالفین پروگرام پر قابض ہو جائیں گے۔

24-07-1986

یاددہانی

آج بمورخہ 26 جولائی 1986ء بروز ہفتہ بوقت 10 بجے صبح بمقام اڈہ کاٹلنگ ایک ہنگامی اجلاس زیرِصدارت یارمحمد خان منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل ممبران صاحبان نے شرکت کی۔

فقیر گل خان، گل فراز خان، شیر محمد خان، شاہ حسین خان، دلبر خان، عثمان غنی، راجہ خان، شاکر خان، حمید گل خان، نور غلام خان۔

اجلاس میں یہ قرار پایا کہ مسمی سبز علی خان نمبردار مسلسل بے وقوفی اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور باوجود پہلے نوٹس کے ابھی تک دفتر ہٰذا میں حاضر نہیں ہوا جس کی وجہ سے ممبران پارٹی کے مطابق پارٹی سے خارج ہونے کا مستحق قرار پایا ہے لیکن پھر بھی اُن کی دیرینہ خدمات کی وجہ سے ممبران اُن کو مزید 24 گھنٹے کی مہلت دیتے ہیں۔ مہلتِ مذکورہ کے گزر جانے کے بعد اُن کی طرف سے کوئی رحم کی اپیل، درخواست یا دیگر کوئی عذر معذرت کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ اُن کو ایک بار پھر متنبہ کیا جاتا ہے کہ ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچے اور اپنی اولین فرصت میں پارٹی دفتر میں حاضر ہو جائیں۔ جتنی جلدی وہ پارٹی میں حاضری دیں گے اُن کے لئے بہتر ہوگا ورنہ ایسا نظر آتا ہے کہ اکیلے پن کی وجہ سے بےموت مارے جائیں گے اور دنیا و آخرت میں ذلیل وخوار ہوں گے۔ ہم تمام پارٹی ممبران اُن سے ہمدردانہ درخواست کرتے ہیں کہ فوراً سے پیشتر پارٹی دفتر آکر حاضری دیں اور اپنی گناہوں کی معافی مانگیں۔

ازطرف

جملہ ممبران پارٹی

نوٹ: آپ کے نہ آنے کی صورت میں ساری پارٹی دلبر خان کے رحم وکرم پر ہوگی اور اس کا سارا نقصان بالآخر تمہیں اُٹھانا پڑے گا۔

قرضہ کی واپسی

کہتے ہیں کہ ہوشیار پرندہ پہلے تو جال میں نہیں پھنستا لیکن جب پھنستا ہے تو دونوں پاؤں سمیت پھنستا ہے۔ یہ بات ہمارے فقیر گل خان پر بھی صادق آتی ہے۔ دوست کہتے ہیں کہ پہلے تو وہ آسانی سے غلطی نہیں کرتے لیکن جب کرتے ہیں تو وہ کوہِ ہمالیہ جتنی بڑی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ فقیر گل خان اور راجہ خان کو عدالت کی طرف سے سمن موصول ہوا کہ بینک کے قرضہ کی عدم ادائیگی کی وجہ سے پشاور میں عدالت کے روبرو پیش ہوں۔ یہ دیکھ کر دونوں بہت گھبرا گئے کیونکہ اُن دنوں حکومت نے بینک ڈیفالٹرز کے خلاف سخت کارروائی شروع کی تھی۔ انہوں نے اپنے حافظہ پر زور دیا لیکن انہیں یاد نہیں آیا کہ انہوں نے کبھی بینک سے قرضہ لیا ہو۔ لیکن عدالتی سمن میں تو قرضہ کی عدم ادائیگی کا واضح لکھا ہوا تھا۔ پھر اچانک انہیں یاد آیا کہ کچھ سال پہلے انہوں نے بینک سے قرضہ لینے والے ایک شخص کی ضمانت دی تھی۔ سب سے تشویشناک بات یہ تھی کہ انہیں اس شخص کا نام یاد نہیں تھا۔ انہیں اتنا تو یاد تھا کہ ان کا تعلق لوندخوڑ کے علاقہ سے تھا لیکن اُن کا نام اور پتہ بھول چکے تھے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ اُس شخص کا پتہ چلایا جائے لیکن اس میں ناکام رہے۔ اس سے اُن کی تشویش اور بڑھ گئی۔ اگر عدالت میں جج نے اُن سے قرضہ لینے والے کا نام پوچھ لیا اور وہ نام نہ بتا سکے تو جج غصے میں آکر اُنہیں یقیناً جیل بھیج دیں گے۔ اگر فرض کیا جیل نہ بھی بھیجیں تو واجب الادا قرضہ تو اُن سے ضرور وصول کریں گے جو سود در سود کی وجہ سے کئی گنا بڑھ چکا ہوگا۔

راجہ خان نے غصے میں آکر فقیر گل خان سے کہا کہ یہ سب اُن کا کیا دھرا ہے کیونکہ وہ شخص انہی کا جاننے والا تھا۔ فقیر گل خان نے پشیمانی سے کہا کہ اُنہیں کیا پتہ تھا کہ اس کی پاداش میں انہیں یہ دِن دیکھنا پڑے گا۔ آج کل کسی کے ساتھ نیکی کا دور نہیں ہے اگر کسی کے ساتھ نیکی

کروگے تو یہ سزا بھگتنی پڑے گی۔

سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے۔عدالت میں حاضر نہ ہونا تو بہت خطرناک تھا کیونکہ اس صورت میں تو جیل جانا یقینی تھا لیکن حاضر ہوکر وہ اپنی صفائی میں آخر کیا کہتے۔اگر انہوں نے یہ کہا کہ وہ تو قرضہ لینے والے کا نام بھول چکے ہیں تو عدالت اُن کی اس لغزش پر بھی انہیں کوئی سزا سنا سکتی تھی۔ عدالت میں اُن کی پیشی کا دِن جتنا نزدیک آ رہا تھا اتنی اُن کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر وہ دن آ گیا اور وہ دونوں دھڑکتے دل کے ساتھ عدالت کی طرف روانہ ہوئے۔اُن کے دل کا حال صرف اللہ جانتا تھا۔اس سخت وقت میں بھی راجہ خان فقیر گل خان کو کوسنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔جب وہ عدالت پہنچے جس کی کارروائی عام عدالت کی بجائے ایک بنگلہ میں ہو رہی تھی تو وہاں پر انہوں نے پولیس کی بھاری نفری موجود پائی۔اس سے وہ اور گھبرا گئے۔اس کے علاوہ وہاں پر بڑی بڑی گاڑیاں موجود تھیں۔

وہ ڈرتے ڈرتے بنگلہ کے اندر داخل ہوئے۔انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اُنہیں ہتھکڑیاں پہنا کر پشاور جیل بھیجا جا سکتا ہے۔انہوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں عدالت کے کلرک کو بتایا کہ انہیں عدالت نے طلب فرمایا ہے۔کلرک نے کہا ''اچھا! آج تو تاریخ تبدیل ہوگئی ہے۔ ویسے آپ لوگوں کے ذمے کتنا قرضہ واجب الادا ہے؟'' انہوں نے بتایا کہ وہ تو ضمانتی ہیں لیکن اُس شخص نے پانچ ہزار روپے قرضہ لیا ہے۔اُس کلرک نے اُن دونوں کو ایسی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔جیسے وہ کسی اور دنیا کے مخلوق ہوں اور کہا ''یہ لمبی گاڑیاں دیکھ رہے ہو'' اُن دونوں نے حیرانی سے جواب دیا ''ہاں''۔''ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے ایک کروڑ سے کم قرضہ لیا ہو۔ ایک تم بیوقوف ہو کہ پانچ ہزار کے ضمانتی ہو کے منہ اُٹھائے عدالت چلے آئے ہو۔دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔اور آئندہ مجھے تمہاری شکل نظر نہ آئے۔جاؤ۔۔۔نکل جاؤ'' کلرک غصہ میں بولے جا رہا تھا۔یہ سننا تھا کہ اُن دونوں کی جان میں جان آئی اور وہ تقریباً بھاگتے ہوئے عدالت سے نکلے اور پیچھے مڑ کر کلرک کا شکریہ بھی ادا کرنا بھول گئے۔

میں نے کالام دیکھا

آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا دوستوں کو بڑی شدت کے سے انتظار تھا۔ پروگرام بلکہ ایک اچھا پروگرام تیار کرنا بڑا محنت طلب کام ہے۔ مثلاً پروگرام کہاں کا بنایا جائے۔ ڈاٹسن یا فلائنگ کوچ کا انتظام کیا جائے، کن کن کو دعوت دی جائے، رقم کتنی ہو، کس دوست پر کتنا چندہ ڈالا جائے وغیرہ وغیرہ۔ آج ہفتہ کا دن ہے اور جولائی کی بارہ تاریخ۔ بالاخانہ کے نیچے سفید براق فلائنگ کوچ کھڑی ہے کوچ کے چھت پر کھانے پینے کی اشیاء، کراکری، کمبل، آم کی پیٹیاں وغیرہ لدی ہوئی ہیں۔ دوست بڑی تعداد میں آئے ہوئے ہیں۔ کچھ کھڑے، کچھ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ کچھ دوست بچا کچا سودا، کپڑے کی صافی وغیرہ خریدنے کی تگ و دو میں ہیں۔ کچھ دوست آ رہے ہیں، سعید خان لوندخوڑ سے موٹر سائیکل پر تشریف لے آئے ہیں۔ بخت بلند خان اور شمیم خان بھی موجود ہیں۔ کوچ بس روانہ ہونے والی ہے۔ ایک نام بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ گل شیراز خان موجود نہیں ہیں۔ پروگرام بغیر گل شیراز خان کے شروع ہونے والا تھا۔ میری بے چینی بڑھ رہی ہے۔ راجہ خان سے گل شیراز خان کا پوچھا، تسلی بخش جواب نہ پا کر اور بے چین ہوا۔ تجویز دی کہ کیوں نہ کوچ گل شیراز خان کو لانے کے لئے بھیجی جائے۔ راجہ خان، صوبیدار صاحب نور غنی خان اور غالباً ملک صاحب سبز علی خان کوچ میں بیٹھ کر ہسپتال روانہ ہوئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد کوچ واپس آئی۔ میں نے دور سے گل شیراز خان کا صاف و شفاف چہرہ دیکھا۔ جان میں جان آئی۔ پروگرام ابتداء میں کامیاب ہوتا نظر آیا۔ ہمارے تمام دوست بہت ہی اچھے ہیں گل شیراز خان عمر میں سب سے چھوٹے کام میں سب سے بڑے۔

روانگی میں اگر چہ تھوڑی سی تاخیر ہوئی لیکن یہ تاخیر ہمارے پروگرام کے لئے بڑی اچھی ثابت ہوئی۔ بازار میں موجود لوگوں کی نظریں ہماری طرف تھیں۔ ہمارے کچھ مخالف بھی گزرے میں نے دیکھا بڑے ڈسٹرب لگ رہے تھے۔اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مخالفین کا خیال تھا کہ پروگرام پھیکا اور کمزور ہوگا۔ اور انہیں طنز اور ہنسی کا موقع ہاتھ آجائے گا اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے خود بھی پروگرام کی اس درجہ کامیابی کا یقین نہیں تھا جو کچھ میں اس وقت دیکھ رہا تھا۔ میری توقعات سے بڑھ کر تھا۔ میں کپڑوں میں نہیں سمارہا تھا اور خون سیروں بڑھ رہا تھا۔ سب دوست بہترین کپڑوں میں ملبوس گلاب کے پھولوں کی طرح لگ رہے تھے۔ دوست کثیر تعداد میں تشریف لا چکے تھے بالکل میلہ کا سماں لگ رہا تھا۔

ہم نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور کوچ روانہ ہوئی۔ اپنی دیرینہ عادت کے خلاف ملک صاحب سب سے آخری سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ میرا خیال تھا کہ ملک صاحب دیگر دوستوں کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا موقع دے رہے ہیں اور راستہ بھی چونکہ آگے سخت آرہا ہے کسی وقت کسی دوست کی طبیعت بگڑ سکتی ہے یا چھوٹا موٹا حادثہ ہوسکتا ہے اس صورت میں ملک صاحب زیادہ مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ضرورت مند ساتھی کے لئے بآسانی مدد کو پہنچ سکتے ہیں اور بزرگوں کا یہی تو کام ہوتا ہے اور ملک صاحب کا شمار مستند بزرگوں میں ہوتا ہے لیکن جلد ہی میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ کوچ میں جب ہنسی مذاق شروع ہوئی اور کچھ دوستوں نے ملک صاحب کو چھیڑنا شروع کیا۔ ملک صاحب کہنے لگے۔''اسی لئے تو میں پیچھے بیٹھا ہوں تاکہ تم سب پر نظر رکھ سکوں۔ جو کوئی ایسی ویسی حرکت کرے اس کو بڑا چاقو ماروں''۔ اب تو خیر ملک صاحب کافی بوڑھے ہوگئے ہیں۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے میں نے ملک صاحب کا غصہ دیکھا ہے خیر اُن دنوں ملک صاحب جوبن پر تھے۔ مزاج میں بے حد تیزی تھی۔ شخصیت ایسی تھی کہ ہر کوئی اُن کے رعب میں آجاتا تھا۔ یہ اور بات کہ فقیر گل خان اور دلبر خان اُن سے کبھی متاثر نہیں ہوئے بلکہ متاثر کیا ہوتے انہوں نے تو یہ اپنا فرض سمجھ لیا ہے کہ دوسرے لوگوں پر ملک صاحب کے رعب کو

کس طرح کم کریں۔ شاکر مرزا صاحب نے جب پہلی دفعہ ملک صاحب کو دیکھا تو اُن سے انتہائی متاثر ہوئے اور ان کی بہت عزت کرنے لگے۔ فقیر گل خان اور دلبر خان سے کہاں یہ برداشت ہوسکتا تھا انہوں نے مختلف طریقوں سے ملک صاحب کی پوزیشن خراب کرنے کی کوشش شروع کی اور اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہے کیونکہ اس کام میں انہیں دوسرے ساتھیوں کی مدد بھی حاصل رہی۔

کوچ لوند خوڑ اڈہ پر پہنچی۔ گل خان اور خان (بخت بلند خان) نے تربوز خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ چونکہ میں پہلی بار خزانچی مقرر ہوا تھا۔ میں نے سو کا نوٹ گل خان کو تھما دیا۔ صوبیدار صاحب نورغنی نے امرسوں کی فرمائش کی۔ ریدا دگل خان، ملک صاحب، جمشید خان، راجہ خان، سعید خان اور کئی دیگر دوستوں نے تائید کی۔ پچاس کا نوٹ صوبیدار صاحب کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کچھ پیسے گل خان نے واپس کر دیئے۔ تربوزوں کے ساتھ لیموں اور گیس کے لئے مینٹل بھی خریدے۔

کوچ روانہ ہوئی۔ ہاتھیان، شیر گڑھ، سخاکوٹ سے ہوتی ہوئی درگئی میں کچھ دیر کے لئے رکی اور پھر ملاکنڈ کی چڑھائیوں پر چلنے لگی۔ بٹ خیلہ سے ہوتے ہوئے چکدرہ پل کے پاس سے ہوتے ہوئے تھانہ کراس کرتے ہوئے چائے پانی کے لئے ایک ہوٹل کے پاس رُکے۔ سب دوست اتر گئے۔ ملک صاحب پچھلی سیٹ پر ابھی تک براجمان تھے۔ عرض کیا ملک صاحب، چائے کے لئے اُتر جایئے۔ فرمانے لگے۔ ''چائے نہیں پیتا۔'' میں ہوٹل گیا۔ پیپسی کی بوتل لے کر ملک صاحب کے ہاتھ میں تھما دی۔ ملک صاحب مسکرائے۔ ہونٹ ٹھنڈی پیپسی پر رکھ دیئے۔ میں واپس چائے پانی لینے کے لئے ہوٹل آیا۔ تھوڑی دیر بعد ملک صاحب بھی ہوٹل تشریف لے آئے۔ شاید ٹھنڈی پیپسی نے اپنا کام دکھایا ہو۔ ملک صاحب کو چائے کی طلب ہوئی اور ایک کے بجائے دو کپ چائے نوش جان کی۔

ہمارا قافلہ آگے روانہ ہوا۔ سوات کے مضافات شروع ہو چکے ہیں۔ موسم میں خنکی

بڑھ رہی ہے، دریائے سوات کے کنارے اور پہاڑیوں پر درخت اور سبزہ دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔کوچ نے رفتار پکڑ لی ہے۔لنڈا کی، کوٹہ، ابوہ، بریکوٹ، نواں کلی، تندوڈاگ، گوگ درہ، لالہ گانوکلی سے ہوتے ہوئے سوات کے دارالخلافہ مینگورہ پہنچ گئے چونکہ پہلے سے مرغزار جانے کا پروگرام تھا ہمارا قافلہ مینگورہ میں نہیں رُکا۔ چندمنٹ میں سیدوشریف پہنچ گئے اور گاڑی سیدوشریف سے نکل کرسیدھی مرغزارسڑک پررواں دواں تھی۔اب ہم ایک ایسی وادی میں سفر کررہے تھے جو بے حدخوبصورت تھی۔ دونوں طرف پہاڑیاں تھیں جو درختوں اور رنگ برنگ جھاڑی بوٹیوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ پہاڑیوں کے دامن میں ریشم کی طرح نرم ونازک لمبی گھاس وافرمقدار میں اُگی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی گائے بڑی شدت سے یاد آنے لگی۔اے کاش! اس وقت وہ میرے ساتھ ہوتی میں یہاں کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھتا اور گائے کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتا۔سگریٹ پرسگریٹ سلگاتا نظارا کرتا۔گائے کا اس خوبصورت گھاس میں چرنے کا مزیدلطف اُٹھاتا۔وہ جو کہتے ہیں انسان کی ہرخواہش تو پوری نہیں ہوتی۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہرخواہش پہ دم نکلے۔ کچھ ہی دیر کے بعد کوچ مرغزارپہنچ کررُکی۔ مرغزار میں چھوٹا سا خوبصورت بازار ہےاور بڑی خوبصورت جگہ ہے۔(نامکمل)

نوٹ: مذکورہ مضمون تقریباً 86 صفحات پرمشتمل تھا لیکن بدقسمتی سے باقی کےصفحات کہیں گم ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ کتاب کی زینت نہ بن سکے۔

......☆......

حلقۂ یاراں

یارقند خان کی شخصیت اور شگفتہ تحریریں

تالیف
ڈاکٹر شبیر احمد خان

کتاب کا نام: حلقۂ یاراں

مؤلف: ڈاکٹر شبیر احمد خان

کمپوزنگ: حسین گل سائل

سلسلہ اشاعت: باراول

تاریخ اشاعت: فروری ۲۰۱۷ء

سرورق: ایکسپرٹ گرافکس پشاور

مطبع: ایکسپرٹ گرافکس پشاور

تعداد: ۵۰۰

ملنے کے پتے:

۱۔ شاہ حسین خان 0345-3966667

۲۔ عدنان بشیر 0312-8796896

انتساب

والد صاحب کے دوستوں کے نام

ہیں مکاں و سرا و جا خالی
یار سب کوچ کر گئے شاید
میرؔ

فہرست